سچ کیا ہے؟

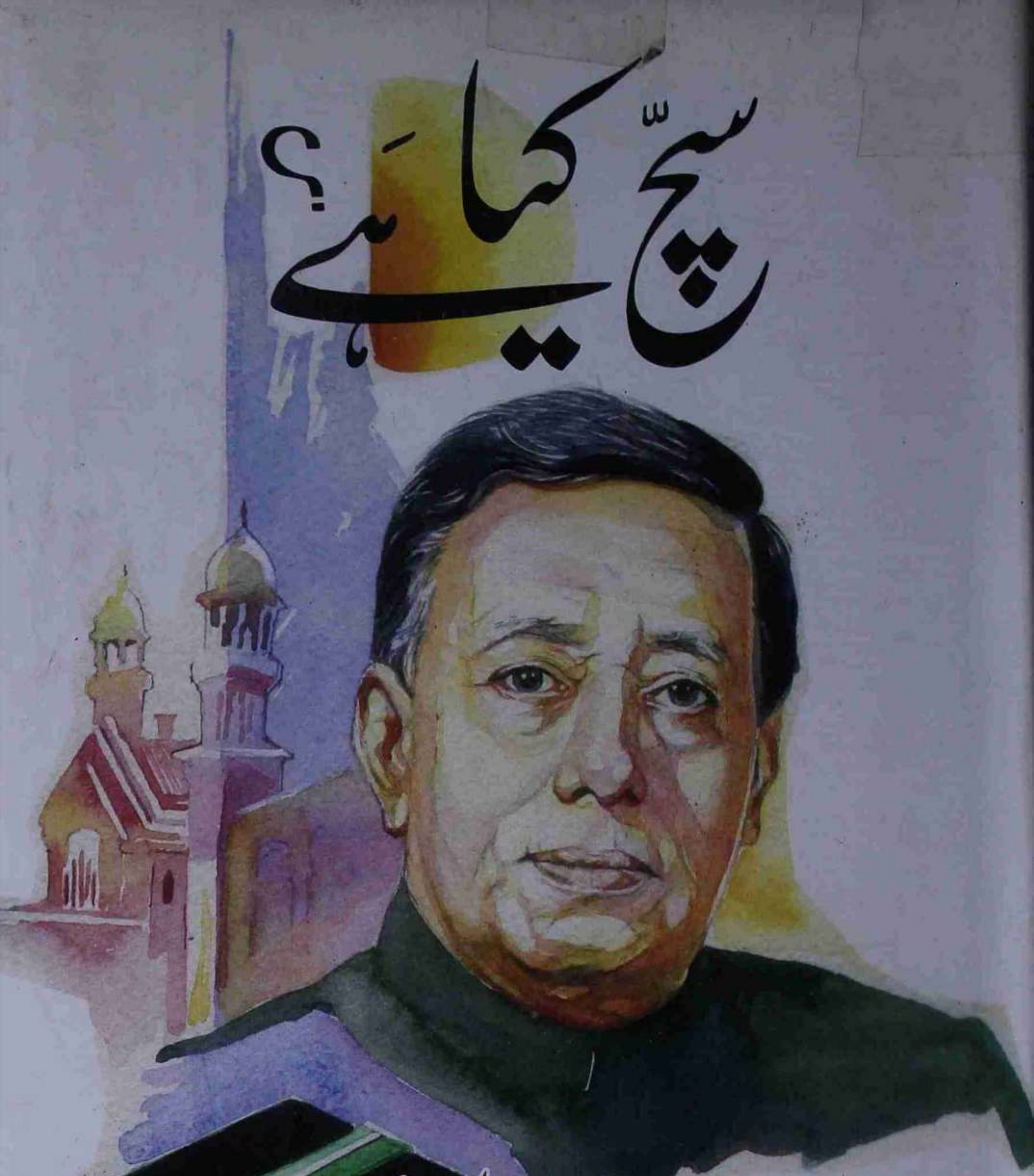

سیّد سجّاد علی شاہ

(ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان)

چیف جسٹس سجاد علی شاہ
ماہ وسال کے آئینے میں

جناب سجاد علی شاہ 17 فروری 1933ء کو کراچی پیدا ہوئے۔ 1951ء میں میٹرک کیا اور 1956ء میں یجویشن کرنے کے بعد قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن گئے۔ نہوں نے 1959ء میں لنکن ان سے بیر سٹری کا امتحان پاس کیا۔ س کے بعد وطن واپس آگئے۔ 1960ء میں ان کی ہائی کورٹ کے کیل کی حیثیت سے رجسٹریشن ہوئی جس کے بعد انہوں نے اچی میں قانون کی پریکٹس شروع کر دی۔ 1963ء میں ان کا تقرر ڈسٹرکٹ پبلک پراسیکیوٹر اور گورنمنٹ پلیڈر کی حیثیت سے لسبیلہ (بلوچستان) میں ہوا جس کا ہیڈ کوارٹر کراچی میں تھا۔ 1967ء میں ان کی براہ راست ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر تقرر ہوا یہ آسامی بار کے ممبران کے لئے مخصوص تھی اور انہوں نے میرٹ پر یہ عہدہ حاصل کیا۔ انہوں نے ون یونٹ کے دوران پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج حیثیت سے فرائض انجام دیئے اور جب ون یونٹ ختم ہونے کے بعد صوبے بحال ہو گئے تو انہیں سندھ میں تعینات کیا گیا۔ جناب سجاد علی شاہ 1974ء میں وفاقی وزارت قانون و پارلیمانی امور میں جوائنٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ 1977ء میں انہیں سپریم کورٹ آف پاکستان کا رجسٹرار مقرر کیا گیا۔ 1978ء میں وہ سندھ ہائی کورٹ کے جج تعینات کئے گئے۔ جج کے فرائض کے ساتھ ساتھ انہیں

س / ٨٥

سچ کیا ہے؟

سچ کیا ہے؟

سید سجاد علی شاہ
(ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان)

شام کے بعد پبلی کیشنز ۱۳۔اے بہاول پور روڈ۔ لاہور

اہتمام اشاعت
امیر
سمیر

شام کے بعد

جملہ حقوق محفوظ

جون 1999ء
پروڈکشن : حمیرا اکرم
قیمت : ۲۵۰ روپے
شناخت پرنٹرز لاہور

انتساب

پاکستان کے نام

لاہور سے کراچی تک کا سفر

یہ سچ ہے کہ کہا' لکھا اور سنا زندگی بھر انسان کا پیچھا کرتا ہے..... میں نے ساری زندگی اس پر عمل کیا ہے..... لوگوں سے سوال کر کے ان کا جواب سنا ہے اور جو وہ کہتے ہیں میں کاغذ پر لکھ لیتا ہوں اور پھر میرا لکھا رات دن میرا پیچھا کرتا ہے۔ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی کچھ کہہ کر خیال کو شکل عطا کرتا ہے۔ قلم کے لئے مہمیز کا کام کرتا ہے اور قلم کاغذ پر چلنے لگتا ہے اور پھر کاغذ کتاب کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اس کتاب کا پس منظر کچھ ایسا ہی ہے..... کہانی کچھ یوں ہے کہ یکم اکتوبر 1997ء کو الحمرا ہال نمبر 3 میں سابق چیف جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی یادداشتوں پر مبنی میری کتاب "عہد ساز منصف" کی تعارفی تقریب تھی۔ اس تقریب کی صدارت اس وقت کے چیف جسٹس آف پاکستان سید سجاد علی شاہ نے کی۔ اس موقع پر دیگر حضرات کے علاوہ احمد عقیل روبی نے بھی خطاب کیا۔ انہوں نے کہا "قبل ازیں تنویر ظہور سابق چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ ڈاکٹر جاوید اقبال اور سابق چیف جسٹس آف پاکستان ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی یادداشتیں قلمبند کر چکا ہے..... مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ریٹائرمنٹ کے بعد جسٹس سجاد علی شاہ کی باری آئے گی"

اس وقت میرے ذہن میں ایسی بات نہ تھی۔ عقیل روبی کی بات نے مہمیز کا کام کیا۔ میں نے اسی وقت سوچ لیا کہ آئیڈیا اچھا ہے جب مجھے اظہار خیال کے لیے بلایا گیا تو میں نے عقیل روبی کی بات کو دہراتے ہوئے جسٹس سجاد علی شاہ سے توقع ظاہر کی کہ وہ عقیل روبی کی تجویز پر مثبت غور فرمائیں گے۔ سجاد علی شاہ صاحب کے لیے بچ نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ انہیں اعلان کرنا پڑا کہ میں ریٹائرمنٹ کے بعد تنویر ظہور کو اپنی یادداشتیں ریکارڈ کراؤں گا۔ ریٹائرمنٹ کے فوراً بعد شاہ صاحب نے اعلان کیا کہ وہ اپنی سوانح حیات تحریر کر رہے ہیں۔ میرے لئے یہ خبر دھماکے سے کم نہ تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ شاہ صاحب نے وعدہ مجھ سے کیا تھا۔ میرا قلم ان کی یادداشتیں قلم بند کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ چند دوستوں نے اس طرف توجہ دلائی۔ میں نے اس کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔

میں مایوسی کو گناہ سمجھتا ہوں کہ ابلیسیت کا دوسرا نام مایوسی ہے۔ ابلیس کے معنی مایوسی اور ناامیدی کے ہیں۔ مسلمان کبھی مایوس اور ناامید نہیں ہوتا قرآن کی آیت ہے لا تقنطوا من رحمته الله (39/53) "اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو"

قرآن پاک کی اس آیت کو مد نظر رکھ کر میں نے شاہ صاحب کو کراچی فون کیا۔ انہوں نے فرمایا "مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ میں کسی مناسب موقع پر آپ کو کراچی آنے کی زحمت دوں گا..... اور اپنی یادداشتیں حسب وعدہ ریکارڈ کراؤں گا" میں نے شاہ صاحب کی توجہ ان کے بیان کی طرف دلائی تو انہوں نے کہا..... میں اپنی سوانح حیات انگریزی میں تحریر کر رہا ہوں۔ آپ جو بائیو

گرافی لکھیں گے' وہ اردو میں ہو گی۔ میں نے آٹوبائیوگرافی کی ابتدا وکالت کے دور سے کی ہے۔ جبکہ آپ میرے خاندانی پس منظر سے آغاز کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے آٹوبائیوگرافی اور بائیوگرافی میں کافی فرق ہو گا۔ میں نے کہا تھا نا' مایوسی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے روشنی کی کرن دکھادی۔ میرا تو نام ہی ''تنویر'' ہے اور پھر ''ظہور'' روشنی کو ظاہر کرنے والا۔ جہاں نور ہو گا' وہاں تاریکی کا کیا کام؟

میں نے کوشش اور رابطہ جاری رکھا۔ شاہ صاحب جب بھی لاہور تشریف لاتے۔ ان سے جمخانہ ملاقات ہوتی۔ (لاہور میں ان کا قیام Gymkhana Guest room میں ہوتا) یہ سلسلہ تقریباً چھ سات ماہ چلتا رہا۔ بالاخر انہوں نے کراچی آنے کی دعوت دی۔ ستمبر 1998ء کی تاریخ طے ہو گئی۔ انہوں نے لاہور سے اسلام آباد جانا تھا۔ اس کے بعد ان کی کراچی روانگی تھی۔ میں نے بھی کراچی روانگی کا پروگرام طے کر لیا۔ میں خوش تھا کہ بیس برس کے بعد کراچی جارہا ہوں۔ بیس برسوں بعد اب کراچی کیسا ہو گا؟ میرا دل بے چین تھا کہ جلد سے جلد کراچی پہنچ جاؤں۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شاہ صاحب لاہور سے اسلام آباد پہنچے تو خبر چھپی ''سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس جناب سجاد علی شاہ پر اسلام آباد میں دِل کا دورہ پڑا اور وہ پمز میں داخل ہیں''

میں نے فوراً حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دی اور شاہ صاحب کی صحت کے لئے دعا کی۔ گو اس دُعا میں میری غرض بھی شامل تھی مگر میری خواہش ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تادیر سلامت رکھیں کہ ابھی نہ صرف ملک و قوم کے لئے بہت سا کام کرنا ہے بلکہ اپنے بچوں کی خوشیاں بھی دیکھنا ہیں۔

شاہ صاحب کی تین بیٹیاں اور ایک بیٹا محمد علی ہے۔ محمد علی ابھی زیر تعلیم ہے ابھی انہوں نے محمد علی کو سہرا باندھے دیکھنا ہے' قبولیت کی بھی گھڑی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میری دُعا قبول کر لی تھی اور شاہ صاحب چند دنوں بعد صحت یاب ہو کر اسلام آباد سے کراچی روانہ ہو گئے۔

ان کے معالجین نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ یوں میرا کراچی کا دورہ بیس برسوں بعد بھی تعطل کا شکار ہو گیا۔ چند ماہ بعد شاہ صاحب لاہور تشریف لائے۔ میں ملاقات اور یاد دہانی کے لئے حاضر ہوا۔ شک میں بھی مبتلا ہو گیا کہ شاید شاہ صاحب یادداشتیں ریکارڈ کرانا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ وہ خود اپنی بائیو گرافی لکھ رہے ہیں۔ میری کیفیت کو بھانپ کر شاہ صاحب نے کہا۔ ''ٹال مٹول سے شاید تم مایوس ہو گئے ہو۔ میں سید زادہ ہوں۔ وعدہ کی پاسداری کروں گا میں جو تمہیں تاریخیں دیتا ہوں۔ یہ اسی طرح تاریخیں ہیں' جو ہم مقدموں کے دوران دیتے ہیں۔ انشاء اللہ فیصلہ تمہارے حق میں ہو گا'' یہ جملہ انہوں نے دسمبر 1998ء میں کہا۔ جبکہ انہیں ریٹائر ہوئے ایک برس گزر گیا۔

اللہ اللہ کر کے میرے حق میں فیصلہ ہو گیا اور میں 9 مارچ 1999ء کو کراچی روانہ ہو گیا۔ میں اس موقع پر اپنے پیارے دوست معروف شاعر' اور ادیب اکرم کنجاہی کا ذکر کروں گا کہ جن کی کوششوں سے کامیابی نصیب ہوئی۔ اکرم کنجاہی سٹیٹ بینک کراچی میں آفیسر ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات لاہور میں ایک پبلشر کے دفتر میں ہوئی۔ پہلی ملاقات ہی میں ہم دوستی کے لازوال رشتے میں منسلک ہو گئے۔ اکرم کنجاہی کا تعلق ضلع گجرات سے ہے۔ میرے

سسرالی بھی گجرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات بھی ہماری قربت کا باعث بنی۔ اکرم کنجاہی سے میری مراسلت رہتی ہے۔ کبھی کبھار فون پر بھی ہیلو ہیلو ہو جاتی۔ اکرم کنجاہی نے میری درخواست پر جسٹس سجاد علی شاہ صاحب سے مسلسل رابطہ کئے رکھا۔ مجھے شاہ صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ''سٹیٹ بینک والے آپ کے دوست اکثر فون کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے میں بھاگ نہیں سکتا'' شاہ صاحب کو اکرم کنجاہی کا نام یاد نہ رہتا۔ وہ انہیں ''سٹیٹ بینک والے دوست'' کے حوالے سے یاد کرتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ فی زمانہ اکرم کنجاہی جیسے دوست ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اس نفسا نفسی کے دور میں پیدا نہیں ہوئے۔ یا پھر ان کی تربیت اس قسم کی ہوئی کہ وضعداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

کراچی روانگی سے قبل ہی اکرم کنجاہی نے مجھے خط میں لکھ دیا تھا کہ آپ ہوٹل یا کسی اور جگہ قیام کے بجائے میرے ہاں قیام کریں گے۔ لاہور سے کراچی تک نثار ترابی میرے ہمسفر رہے۔ نثار ترابی کا تعلق راولپنڈی شہر سے ہے اور ان کے سسرال کراچی میں ہیں۔ نثار ترابی نہ صرف معروف شاعر' نقاد کمپیئر اور محقق ہیں۔ بلکہ وہ بہترین دوست اور اچھے ہمسفر بھی ہیں۔ مجھے وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز ہیں۔ کراچی پہنچنے کے فوراً بعد نثار ترابی مجھے اپنے سسرال لے گئے۔ اتفاق سے وہ بھی ہمارے بھٹی بھائی ہیں یعنی ایم اے بھٹی انتہائی ملنسار اور خوش اخلاق۔ پہلی ہی ملاقات میں یوں محسوس ہوا کہ ہم برسوں سے شناسا ہیں..... ایک رات بفرزون ان کے ہاں قیام رہا۔ اگلے روز اکرم کنجاہی نے نثار ترابی سے شکوے کے انداز میں کہا..... ''مہمان میرا ہے اور

اچک آپ نے لیا ہے" محمد اکرم بھٹی صاحب کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ میں وہاں سے شفٹ کروں..... میرے اصرار پر انہوں نے بادل نخواستہ اجازت دے دی۔ اکرم کنجاہی صاحب کی اہلیہ اپنے میکے (جلالپور جٹاں) آئی ہوئی تھیں۔ یوں ہم دونوں کو آزادانہ ماحول میں گپ شپ کا موقع مل گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اکرم کنجاہی کی کوشیش شامل نہ ہوتیں تو شاید یہ کتاب آپ تک نہ پہنچ پاتی۔ اکرم کنجاہی جیسے دوست کا شکریہ الفاظ میں ادا کرنا ناممکن ہے۔ 11 مارچ کو خاکسار' اکرم کنجاہی اور نثار ترابی کے ہمراہ جسٹس سجاد علی شاہ کی رہائش گاہ (باتھ آئی لینڈ) پہنچے تو سیکورٹی اہلکاروں نے کہا "جسٹس صاحب گھر میں موجود نہیں" یہ سن کر میرے پاؤں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی..... یا اللہ میں تو 20 برسوں بعد ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کر کے آیا ہوں۔ جسٹس شاہ صاحب کو میری کراچی آمد کا علم بھی ہے میں ان سے وقت طے کر کے آیا ہوں۔ میں نے اپنے خشک حلق کو صاف کیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیری اور سیکورٹی پر موجود پولیس اہلکار سے کہا "میرا نام تنویر ظہور ہے لاہور سے آیا ہوں۔ جسٹس صاحب سے وقت طے ہے۔ فون کر کے آیا ہوں۔ انہیں میری آمد کا علم ہے" میرے ان جملوں کے بعد پولیس اہلکار کے رویے میں تبدیلی محسوس ہوئی۔ اس نے کہا "تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ لاہور سے آئے ہو اور ملاقات کا وقت' طے ہے۔ کراچی کے کئی لوگ یونہی منہ اٹھا کے چلے آتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ دیتے ہیں کہ جسٹس صاحب موجود نہیں ہیں" پولیس اہلکار اپنے کیبن میں گیا۔ انٹر کام کے ذریعے جسٹس صاحب کو ہماری آمد کا بتایا تو ہمیں کوٹھی کے اندر جانے کی اجازت ملی۔ جب جسٹس صاحب کے

کمرے میں ہم داخل ہوئے تو وہ ایک شخص کو انگریزی میں اپنی بائیو گرافی ڈکیٹٹ کرا رہے تھے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ہمارے درمیان آکر بیٹھ گئے میں نے کہا۔ ہم انتظار کرتے ہیں۔ آپ چیپٹر مکمل کر لیں..... شاہ صاحب نے کہا کتاب کا کام ابھی رہتا ہے وقت لگے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اپنی کتاب کا کام مکمل کر لوں تو یکسوئی سے آپ کو وقت دوں۔ مجھے مزید دو تین روز چاہئیں۔ اس کے بعد وہ میرے دوست اکرم کنجاہی کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا۔ تنویر صاحب بیس برس کے بعد کراچی آئے ہیں۔ انہیں کراچی کی خوب سیر کراؤ تاکہ میں بھی فارغ ہو جاؤں۔ جسٹس صاحب نے مجھ سے دریافت کیا۔ کیا وجہ ہے آپ بیس برسوں کے بعد کراچی آئے ہو؟ میرا جواب تھا کہ نثار ترابی کے کراچی میں سسرال ہیں۔ اکرم کنجاہی یہاں جاب کرتے ہیں..... میرا یہاں کون ہے؟ میں نے یہ جملہ سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ جسٹس صاحب شاید میرے لہجے کو بھانپ گئے تھے۔ انہوں نے نثار ترابی اور اکرم کنجاہی کو کہا۔ ”بھئی تنویر ظہور کی دوسری شادی کراچی میں کرادو تاکہ ان کا بھی یہاں پھیرا ٹورا رہے“ میرے دونوں دوست اور ساتھی جسٹس صاحب کی بات سن کر خاموش ہو گئے۔ میں نے ان کی خاموشی توڑتے ہوئے کہا ”آپ حضرات جسٹس صاحب کی بات پر غور کریں“

یوں شگفتہ ماحول میں گفتگو جاری رہی۔ جسٹس صاحب نے تین روز بعد یعنی اتوار 14 مارچ کو اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرانے کا حتمی فیصلہ سنا دیا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایک ہی روز (صبح سے شام تک) اپنی یادداشتیں ریکارڈ کرا دوں گا۔ واقعی یہ حتمی فیصلہ اور آخری تاریخ تھی۔ اتوار 14 مارچ کا دن انہوں

نے میرے لئے وقف کر دیا۔ اس روز اکرم کنجاہی میرے ہمراہ رہے۔ اکرم کنجاہی نے ایم بی اے کے ساتھ ساتھ ایل ایل بی کیا ہوا ہے۔ اس لئے قانونی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے بعض ایسے سوال کئے جو میرے لئے مددگار ثابت ہوئے۔ جب تک ریکارڈنگ مکمل نہ ہو گئی۔ میں گومگو کی کیفیت میں رہا۔

جس کھلے ڈھلے اور اپنائیت کے ماحول میں جسٹس صاحب نے یادداشتیں ریکارڈ کرائیں اس سے تمام تھکاوٹ دور ہو گئی اور میرے گلے شکوے جاتے رہے۔

یہ بات بھی خوش آئند تھی کہ ان کا ڈرائنگ روم قرآنی آیات کے کتبوں سے مزین تھا۔

ریکارڈنگ کے دوران ان کے بعض احباب بھی ملاقات کے لئے آتے رہے۔ جس کی بنا پر میں ڈسٹرب ہوتا۔ جسٹس صاحب نے کہا کہ شروع ہی سے میرا معمول رہا ہے کہ میں نے چوکیدار کو ہدایت کر رکھی ہے کہ اتوار کو جو شخص بھی ملاقات کے لئے آئے' اسے میری اجازت کے بغیر اندر آنے دیا جائے۔ یوں اتوار کا روز کھلی کچہری کی مانند ہے۔ جسٹس صاحب صبح 11 بجے سے شام سات بجے تک مسلسل میرے سوالات کے جواب دیتے رہے۔ میں شام میں کسی حد تک اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ مگر جسٹس صاحب تازہ دم دکھائی دے رہے تھے۔

جسٹس سجاد علی شاہ تہذیبی اور مجلسی صفات کے پیکر بے مثال ہیں۔ شرقی معاشرے کی تمام صفات ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ ایک

صفت ان کی مہمان نوازی کی ہے..... یہ ایک ایسی صفت ہے جو صاحب خانہ کے خاندانی پس منظر اور تربیت کی سند پیش کرتی ہے۔ جسٹس صاحب اپنی مسز' بچوں اور دوست احباب سے سندھی میں گفتگو کرتے تھے جو بہت اچھی بات ہے دوپہر کا کھانا ان کے ہمراہ کھانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ دیگر ڈشوں کے علاوہ مچھلی ایک ایسی ڈش تھی جس کے کھانے کو جسٹس صاحب بار بار اصرار کرتے رہے۔ واقعی مچھلی انتہائی لذیز تلی ہوئی تھی۔ لنچ کے علاوہ سارا دن چائے اور دیگر لوازمات کا دور بھی چلتا رہا۔ وقفے وقفے سے وہ ملازم کو آواز دیتے اور کہتے "بابا کوئی چائے وائے لاؤ ناں۔ مہمان آئے ہوئے ہیں" ملازم جوان تھا۔ شاید سندھیوں میں رواج ہے کہ وہ ملازم کو "بابا" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ انٹرویو کے اختتام پر میں نے جسٹس صاحب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کتاب میں آپ کی فیملی کی رائے بھی شامل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنی مسز' بیٹی 'بیٹا نواسا اور نواسی کو کمرے میں بلا لیا۔ میں نے جسٹس صاحب کے بارے میں اہل خانہ کی رائے بھی ریکارڈ کی۔ ایک موقع پر جسٹس صاحب نے کہا کہ مجھے نوجوان شاعر احمد فراز کا کلام بھی پسند ہے۔

احمد فراز کے ساتھ "نوجوان" لفظ کا سن کر ان کی اہلیہ نے قہقہہ لگایا۔ جسٹس صاحب نے پوچھا۔ کیا میں کوئی غلط بات کہہ گیا ہوں ؟ ان کی اہلیہ نے کہا کہ احمد فراز کو "نوجوان" کہنے پر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ جسٹس صاحب نے جواب میں کہا..... "میں نے احمد فراز کا کلام پڑھ کے اندازا کیا کہ وہ نوجوان ہوں گے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی..... اس لئے عمر کا تعین نہ کر سکا' اس دوران اکرم کنجاہی بول پڑے "احمد فراز نوجوانوں کے مقبول شاعر ہیں۔

جسٹس صاحب نے شاید انہیں بھی نوجوان سمجھ لیا ہو"

بہر کیف خوشگوار ماحول میں ان سے اجازت چاہی۔ وہ کوٹھی کے مین گیٹ تک ہمیں رخصت کرنے آئے۔ جسٹس سجاد علی شاہ چیئن سے ریٹائرمنٹ تک اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی حق و صداقت کا علم بلند رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی تمام زندگی لوگوں کو انصاف دینے میں گزری شاہ صاحب ایک سچے اور حق گو انسان ہیں۔ ساری زندگی راہ راست پر چل کر گزاری ہے۔ وہ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے' بھلے انہیں سچ کی پاداش میں زندگی میں نقصان بھی برداشت کرنا پڑے۔ مگر وہ کربلا کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ہمیشہ سچ بولتے رہے۔ انہیں سچ سے پیار رہا ہے۔ بلھے شاہ کے یہ اشعار ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔

سچ سن کے لوک نہ سہندے نیں
سچ آکھیے تے گل پیندے نیں
پھر سچے پاس نہ بہندے نیں
سچ مٹھا عاشق پیارے نوں

ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان سجاد علی شاہ کی یادداشتوں کی یہ مختصر کتاب ایک عہد کی فکری' سیاسی اور عدالتی سرگرمیوں کی روداد ہے۔ دیکھنے میں اگرچہ یہ مختصر ہے لیکن سجاد علی شاہ کی ہر بات کے پیچھے معنی کا ایک دریا خاموشی سے بہہ رہا ہے۔ گفتگو یہ سلسلہ مجھے یقین ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے ضرور اہمیت کا حامل ہوگا۔ امید ہے قارئین میری اس کوشش کو شرف باریابی بخشیں گے۔

آخر میں فرحت عباس شاہ کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

انہوں نے جسٹس سجاد علی شاہ کی یادداشتوں پر مبنی کتاب شائع کرنے کی خواہش کا اظہار اس وقت کیا تھا جب ایک برس پہلے انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں تنویر ظہور کو اپنی یادداشتیں ریکارڈ کراؤں گا۔ فرحت شاہ وقفے وقفے سے مجھ سے دریافت کرتے رہتے کہ شاہ صاحب والی کتاب کا کام کب شروع کر رہے ہو! اگر فرحت شاہ مسلسل ہلہ شیری نہ دیتے رہتے تو شاید ابھی بھی یہ کام پایہ تکمیل تک نہ پہنچ پاتا۔

تنویر ظہور

میرے وچ ملیر، میں ہاں وچ ملیر دے
ول سکدی بس ظالما! جثّے نوں زنجیر
تیرے وس سریر، میں من مارو جھولڑی
(مارو۔ ملیر کے وسنیک۔ یہاں ماروی کا
خاوند مراد ہے)

(سندھی سے پنجابی ترجمہ)

بچپن

میری پیدائش کراچی کے علاقہ لیاری میں ہوئی۔ لیاری اس زمانے میں کراچی کا بہت پرانا علاقہ تھا۔ یہاں پرانے زمانے سے کئی خاندان نسل در نسل آباد چلے آرہے تھے، جن کا شمار علاقے میں مقیم قدیم خاندانوں میں ہوتا تھا۔

میری صحیح تاریخ پیدائش 11 مئی 1934ء ہے لیکن سکول میں 17 فروری 1933ء درج کرائی گئی جو میری بڑی بہن کی تاریخ پیدائش ہے۔ میرا بڑا بھائی اور بہن سکول جاتے تو میں بھی سکول جانے کی ضد کرتا۔ چونکہ اس وقت باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے عمر کی زمانی مدت کے اعتبار سے سکول میں میرے داخلے کی عمر کا زمانہ نہیں تھا مگر میں سکول جانے کے لئے روز ضد کرتا۔ میرے بار بار کے اصرار پر گھر والوں نے آخر کار یہی فیصلہ کیا کہ میری اصلی تاریخ پیدائش کو زیادہ بتایا جائے اور مجھے سکول میں باقاعدہ داخل کرادیا جائے اور یوں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا۔

خاندانی پس منظر

وادی سندھ میں متعدد مشہور خاندانوں کے گھرانے آباد ہیں جو صدیوں سے اپنی قدیم روایات کے نمائندہ خاندان کہلاتے ہیں اور ان کی کئی نسلیں عہدِ موجود میں سندھ کے قرب وجوار میں آج بھی اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔

ہمارا خاندان سندھ کا مشہور سید خاندان ہے جو لکیاری سید کہلاتا ہے۔ پیر صاحب پگاڑا بھی لکیاری سید ہیں۔ ہمارے آباء اجداد کا تعلق ضلع ٹھٹھہ سے ہے اور ضلع ٹھٹھہ ہی ہمارے خاندانی گھرانے کی سب سے نمایاں ضلعی شناخت ہے۔ میرے دادا ازاں بعد ٹھٹھہ سے کراچی میں ملیر کے علاقہ میں قیام پذیر ہو گئے اور وہیں جام گوٹھ میں رہائش اختیار کرلی۔ وہاں اب بھی ہمارا آبائی قبرستان اور ہمارے مکان ہیں جو ماضی کی یادوں کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے دادا اور خاندان کے دیگر بزرگ ملازم پیشہ اور سیلف مَیڈ لوگ تھے۔ ان کی شبانہ روز محنتوں کا نتیجہ ہے کہ ان کے نام اور کام سے واقفیت رکھنے والوں کی قابل ذکر تعداد وطنِ عزیز میں ہر جگہ موجود ہے۔ ان کی کوئی زمین نہیں تھی اور سچ بات یہ ہے کہ وہ غریب طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے والد سید روشن علی شاہ نے

بعد ازاں ملیر سے لیاری کے علاقہ ''نیا آباد'' میں رہائش اختیار کر لی۔ یہاں میرے والد اور چچاؤں نے اپنا مکان بھی بنا لیا۔ سب ایک ہی مکان میں رہائش پذیر تھے۔باہمی محبتوں اور یگانگت کے حوالے سے بھی ہمارا خاندان خاصا مشہور رہا ہے۔

والد صاحب نے کراچی میں تعلیم حاصل کی۔ حصول تعلیم کے بعد انہوں نے سندھ ہائی کورٹ میں ملازمت اختیار کر لی اور ترقی کر کے اسسٹنٹ رجسٹرار کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں ہم ٹرین میں بیٹھ کر ملیر جایا کرتے۔ ملیر سٹی ریلوے سٹیشن پر اتر کر کچی سڑک سے جام گوٹھ جاتے۔ اس زمانے میں وہاں کوئی بس وغیرہ نہیں جاتی تھی۔ ہم اونٹوں پر بیٹھ کر ملیر ندی سے گذر کر وہاں پہنچا کرتے تھے۔ اس دور میں ملیر کا علاقہ سر سبز تھا۔ پورے علاقے میں باغات اور کھیتوں کی بہار ہوتی تھی۔ فطرت کے نظارے اہل ذوق کو دعوت نظارا دیتے اور ہر طرف قدرت کی صناعی کے شاہکار دیکھ کر انسان روحانی طور پر بہت سرشاری حاصل کرتا تھا۔ ملیر کے امرود ایک ایسی موسمی سوغات تھی جسے احباب اپنے چاہنے والوں کو تحفتاً بھیجتے تھے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے آج کل پاکستان کے صوبہ سرحد میں واقع کوہاٹ شہر کو امرودوں کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے' بالکل ایسے ہی حیثیت اس وقت ملیر کو حاصل تھی۔

ملیر ماروی کا دیس بھی ہے۔ ملیر کے بارے میں سندھ کے ممتاز دانشور اور شاعر شیخ ایاز کے شعر ہیں ؎

ابتدائی تعلیم

میں نے پرائمری تعلیم حاجی عبداللہ ہارون سکول نیا آباد میں حاصل کی۔ حاجی عبداللہ ہارون کا شمار تحریک پاکستان کے ان بزرگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی تحریک کے لئے وقف کر رکھی تھی۔ میری ابتدائی تعلیمی مراحل کی انجام دہی بھی حاجی عبداللہ ہارون کے نام سے منسوب اسی تاریخی اہمیت کے حامل سکول میں ہوئی۔ یہ سندھ کے بہت بڑے تاجر تھے۔ انہوں نے اپنے نام سے سکول قائم کیا۔ یہ سندھی میڈیم سکول تھا۔ اس سکول سے پرائمری تک تعلیم حاصل کی۔ ہمارے زمانے میں پرائمری چار جماعتوں تک ہوتا تھا۔ یہ سکول ہمارے گھر کے سامنے تھا۔

سندھ مدرستہ السلام میں پانچویں جماعت میں داخلہ لیا اور وہیں سے میٹرک کیا۔ قائداعظم نے بھی اسی مدرسہ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یوں اگر میں یہ کہوں کہ مجھے بابائے قوم حضرت قائداعظم کے ہم مدرسہ ہونے کا فخر حاصل ہے تو بے جا نہیں ہوگا۔ آپ کو یہ جان کر بھی خوشگوار حیرت ہوگی کہ قائداعظم اور میرے درمیان کئی باتوں میں قدر مشترک پائی جاتی ہے۔ میں نے قانون کی اعلیٰ تعلیم لنکن ان برطانیہ میں مکمل کی جہاں قائداعظم بھی زیر

تعلیم رہے۔ میں نے عملی زندگی کا آغاز وکیل کی حیثیت سے کیا جبکہ بانی پاکستان نے بھی اپنی عملی زندگی کا آغاز وکالت کے پیشے سے کیا تھا۔

ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ تین بھائی اور دو بہنیں۔ میرا نمبر تیسرا ہے۔ خاندان بھر میں مجھے توجہ و شفقت حاصل تھی۔ میں سب کی آنکھ کا قدرتی طور پر تارا تھا۔ گھر والے میرے ناز اٹھاتے تھے۔ میں بہت ضدی تھا اور عام طور پر اپنی ضد منوالیتا تھا۔ مجھے پڑھنے کا بچپن ہی سے شوق رہا ہے۔

مزاج کے لحاظ سے میری تاریخ پیدائش فروری کے مہینے والی درست نہیں۔ مجھے Stars کا شوق ہوا تو میں نے جائزہ لیا کہ مزاج کے اعتبار سے میرا اسٹار فروری والا یعنی Aquarius (دلو) نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اپنی صحیح تاریخ پیدائش معلوم کی جائے تاکہ ان کے مطابق اپنے سٹار کا جائزہ لے سکوں۔ سٹار کے بارے میں میری بڑھتی ہوئی جستجو کو دیکھتے ہوئے نئے سرے سے تاریخ پیدائش پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔ معلوم ہوا کہ میری صحیح تاریخ پیدائش 11 مئی ہے۔ اس ماہ کا سٹار Taurus (ثور) میری طبیعت سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس برج سے تعلق رکھنے والے افراد زندگی میں ہر چیلنج قبول کرتے ہیں۔ برج ثور نظام ابروج کا دوسرا برج ہے عنصر اس کا مٹی ہے۔ حاکم سیارہ زہرہ۔ اس کے حامل افراد کی زندگی اور فکر و عمل میں دیرپا اثرات کی حامل منفی اور مثبت تبدیلیوں کا قوی امکان ہوتا ہے۔ مضبوط تعلقات خصوصاً برج عقرب سے تعلق رکھنے والے افراد سے قائم ہوتے ہیں۔ چیلنج، مقدمات اور شراکت ناموں کے امکانات ہوتے ہیں۔ زندگی میں کامیابی کے بہترین مواقع میسر آتے ہیں۔ خوش قسمتی کی دیوی مہربان رہتی

ہے۔ ملکیت اور دولت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر ایسے افراد کی زندگی میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ضرور رونما ہوتی ہیں۔ بعض دیرینہ خواہشات پوری ہوتی ہیں۔ صحت اچھی رہتی ہے۔

کھیل کود اور شرارتیں

بچہ اور شرارت دو ایسے الفاظ ہیں جن کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بچے کی پہچان ہی اس کی ننھی ننھی شرارتیں ہوتی ہیں۔ ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ جو بچہ شرارت نہ کرے' اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہئے۔ میں بھی بہت شریر تھا۔ سب کو اپنے پیچھے چلاتا تھا۔ میرے آس پاس ہر وقت اپنے ہم عمر بچوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ عموماً شرارت کا آغاز میں ہی کرتا تھا' لہذا مجھے اپنے ہم جولیوں میں ایک لیڈر کی حیثیت حاصل تھی۔ ہمیشہ لیڈر شپ دماغ میں رہتی تھی۔ میرے دوست بھی اعتراض کرتے تھے کہ تم ہمیشہ یہ چاہتے ہو کہ تمہاری بات تسلیم کی جائے۔ تم ہر وقت بس اپنی ہی منواتے رہتے ہو اور کسی کی چلنے نہیں دیتے۔ یوں سمجھ لیں کہ قائدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ ہنسنا ہنسانا پسند تھا۔ لطیفے سنانا اور مذاق کرنا میری عادت تھی۔ بہن بھائیوں اور کزنز (Cousins) کو بہت تنگ کرتا تھا۔ کبھی گھر میں چین سے نہیں بیٹھتا تھا اور نہ دوسروں ہی کو بیٹھنے دیتا تھا۔

سکول میں مجھے گھنٹی بجانے کا بڑا شوق تھا۔ عام طور پر گھنٹی بجانے کی ذمہ داری سینئر طلبہ کی ہوتی تھی۔ طلبہ کو باری باری گھنٹی بجانا ہوتی۔ سکول میں

گھنٹی بجانے کے لئے کوئی الگ سے Peon نہ تھا۔ گھنٹی بجانے والے طلبہ میں سے اگر کوئی غیر حاضر ہوتا تو گھنٹی بجانے کا فریضہ میں ادا کرتا۔ جب سر یا پکڑ کر گھنٹی پر مارتا تو مجھے بہت لطف آتا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ مجھے گھنٹی بجانے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے۔

بچپن میں بچوں کو ڈرایا بھی کرتا تھا۔ چادر اوڑھ کر چہرے پر ماسک پہن کر کھڑا ہو جاتا' جو بچہ بھی قریب سے گزرتا' وہ مجھے اس حلیے میں دیکھ کر سہم جاتا۔

کھیل کود کے دوران بھی شرارتیں کیا کرتا تھا۔ مگر میں یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوا کہ میری شرارتیں اپنی حدوں سے بڑھ کر کبھی اس مقام پر نہیں آتی تھیں جسے آپ گستاخی کا نام دیتے ہیں۔ میں بہت Active تھا۔ دن کا زیادہ تر وقت بھاگ دوڑ میں گزر جاتا۔ سکون مجھ میں بہت کم تھا۔ کئی کھیل میرے شوق کی راہ میں بچھے رہتے۔ سائیکل کا پہیا (Wheel) چلایا کرتا۔ ربڑ کے ٹینس بال سے بھی کھیلتا تھا۔ کرکٹ کے ساتھ ساتھ گلی ڈنڈے کا بھی شوق رہا۔ بچپن میں ہر اس کھیل سے لطف اندوز ہوا جو بچے کھیلا کرتے ہیں۔ میں محسوس کرتا کہ مجھ میں بہت زیادہ انرجی ہے۔ ہم نصابی سرگرمیوں کے علاوہ تعلیم میں بھی بہت اچھا تھا۔

سکول کے زمانے کا ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ ہماری کلاس میں ایک داداگیر ٹائپ لڑکا پڑھتا تھا۔ ڈیل ڈول میں بھی کلاس میں سب سے نمایاں تھا۔ اس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ ہر روز کسی نہ کسی لڑکے کو چٹ لکھ کر بھیجتا کہ سکول کا وقت ختم ہونے کے بعد تم مجھ سے کشتی کرو گے۔ یوں وہ اپنی طاقت کا

مظاہرہ کرتا۔ سکول سے چھٹی کے بعد لڑکے منتظر ہوتے کہ کب دادا گیر لڑکا چیلنج کئے گئے لڑکے سے کشتی کرے اور وہ اس منظر کو دیکھیں۔ اس طرح وہ ہر روز کسی لڑکے سے کشتی کرتا اور اپنی طاقت کے بل بوتے پر مد مقابل کو چت کر دیتا۔

ایک روز شامت اعمال کہ اس نے مجھے چیلنج کر دیا۔ شروع میں پریشان ہوا مگر ہمت نہ ہاری۔ جب سکول سے چھٹی ہوئی تو خیال آیا' بھاگ جاؤں۔ اگر بھاگ جاتا تو پورے سکول میں بزدل اور ڈرپوک مشہور ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ مقابلہ کروں گا اور میدان چھوڑ کر نہیں بھاگوں گا' چاہے مجھے شکست ہو۔ بچپن ہی سے سرنڈر (Surrender) مغلوب ہو جانا میری سرشت میں نہیں۔ مد مقابل کوئی بھی ہو' سامنا کرنے اور چھا جانے کی صلاحیت قدرت نے مجھ میں کچھ اس انداز میں بھر دی تھی کہ میں اکثر بڑے بڑے کاموں میں خود کو لگا لیتا تھا۔ میں اللہ کا نام لے کر میدان میں داخل ہو گیا مد مقابل لڑکا میرا منتظر تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ مجھ سے نسبتاً مضبوط تھا اس لئے میں نے دفاعی انداز اختیار کرنے کے بجائے جارحانہ انداز اختیار کیا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ کرنے میں پہل کرتا تو تو میرے لئے دفاع کرنا مشکل ہو جاتا۔ ابھی وہ مجھ پر حملہ آور ہونے کا سوچ ہی رہا تھا کہ میں نے اس پر اٹیک کر دیا۔ میرے اس اچانک اٹیک پر وہ سنبھل نہ پایا اور گر گیا۔ اس طرح مجھے موقع مل گیا کہ میں اس کی خوب ٹھکائی کروں۔ نتیجتاً وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بھاگنے کے بعد تمام لڑکوں نے میرے ہاتھ اوپر اٹھا کے میری جیت کا اعلان کیا۔ میں مد مقابل لڑکے کی نسبت کمزور اور نحیف تھا مگر حملے میں پہل کرنے کی ترکیب سے اس پر حاوی ہو گیا اور

اسے دفاعی انداز اختیار کرنے پر مجبور کر دیا یا پھر آپ اسے میرے عزم اور حوصلے کی بنیاد پر قائم ہونے والے اس جذبے کا نام دیں گے جس کی موجودگی ہر پہاڑ کو رائی سمجھ کر اڑا دینے کا معجزہ رکھتی ہے۔

میرے اساتذہ

میرے سکول کے زمانے کے اساتذہ بہت اچھے تھے۔ سبھی مشفقانہ توجہ اور مہربان راہنمائی کا استعارا۔ یوں تو کئی شفیق اساتذہ نے مجھے زیور تعلیم سے آراستہ کیا مگر پرائمری میں میرے ایک ٹیچر عبدالغفور اور دوسرے خدا بخش سے بہت علم حاصل کیا۔ حقیقی معنوں میں جن کی یاد آج بھی میرے قلب و نظر کا سرمایہ ہے۔ ان دنوں اساتذہ کو آئیڈیل حیثیت کا رتبہ حاصل تھا۔ سیدھے سادے شریف انسان۔ حلال کی کمائی سے گزارا کرنے والے۔ قناعت پسندی ان کے مزاج کا حصہ تھی اور دنیاوی لالچ کے موجودہ دائروں نے ان کی سادہ زندگیوں کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ ان کی ضروریات محدود ہوتی تھیں۔ آج کل تقریباً ہر شخص طمع، لالچ اور حرص کا شکار ہے۔ ہم اپنے اساتذہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ آج کل کے اساتذہ ٹیوشن پڑھانے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ موٹر سائیکل اور کاروں کے مالک ہیں۔ ہم نے اپنے زمانے میں کبھی ٹیوشن نہیں لی۔ آج کل تختی لکھنے کا رواج نہیں، یہی وجہ ہے کہ طلبہ میں خوشخطی ختم ہو گئی ہے۔ ہم سرکنڈے کے قلم سے تختی پر لکھا کرتے تھے۔ خوشخطی پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ سندھی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں خوش خط ہوں۔ دن میں

دوبار تختی پر لکھنے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ مجھے یہ سعادت بھی حاصل ہے کہ پرائمری میں، میں جن اساتذہ کے زیر تربیت تھا وہ میرے والد کے بھی ٹیچر رہ چکے تھے۔ ان میں ایک ٹیچر کا نام محمد حسن سولنگی ہے۔

سکول کی تعلیم کے زمانے میں ہمارے گھر میں بجلی نہ تھی اس لئے لالٹین کی روشنی میں مطالعہ کرتا۔ ان دنوں تو ریڈیو تھے نہ ہی ٹیلی ویژن۔ آج کل پرائمری میں زیر تعلیم بچہ بھی والدین سے روزانہ خرچ کے لئے پانچ دس روپے سے کم نہیں لیتا۔ ہمیں تو ایک یا دو پیسے ملتے تھے۔ میں اسی میں گزارا کیا کرتا۔ ویسے بھی بچپن ہی سے مجھے دولت کی ہوس نہیں رہی۔ پیسہ میرا کبھی مسئلہ نہیں رہا۔ خرچ کرنے کے لئے جو پیسے ملتے بھی تھے، ان سے کتابیں خرید لیا کرتا۔ چھٹی کے روز اچھی کتابوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا۔ فٹ پاتھ سے پرانی کتابیں خریدتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ میری انا تھی کہ خودداری۔ بہر حال میں خود گھر والوں سے پیسے نہیں مانگتا تھا، والد محترم جتنے پیسے دے دیتے، لے لیا کرتا۔

مذہب سے وابستگی ہمارے خاندان کو ورثے میں ملی تھی یہی وجہ ہے کہ پرائمری سکول کی تعلیم کے ساتھ ہی قرآن پاک کی تعلیم اور نماز کی پابندی شروع ہو گئی تھی۔ ہمارے محلے کے تمام افراد پابندی سے نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ میں فجر کی نماز کے وقت بیدار ہو جاتا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد جاتا۔ نماز جمعہ کے لئے گھر کے تمام افراد اکٹھے مسجد جاتے۔ وہی تربیت آج بھی کام آرہی ہے، میں اپنے بچوں کے ہمراہ نماز جمعہ کے لئے جاتا ہوں۔ ہمارے ہاں پردے کی بھی بہت پابندی ہے۔ گھر کی عورتیں شادی بیاہ کی

رسومات کی ادائیگی میں بھی پردے کا بہت خیال رکھتی تھیں اور بچیوں میں چھوٹی عمر ہی سے باپردہ رہنے کا مذہبی رجحان غالب تھا۔

ہائی سکول کی تعلیم

1944ء کو سندھ مدرستہ الاسلام میں داخلہ لیا۔ یہ سکول آج بھی بولٹن مارکیٹ کراچی میں موجود ہے۔ اس سکول میں سندھی' اردو اور گجراتی تینوں میڈیم میں تعلیم دی جاتی تھی۔ میں A سیکشن میں تھا۔ یہ سیکشن سندھی میڈیم کا تھا۔ اس سکول سے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان دنوں سکول کے پرنسپل Mr. Bhaiji تھے جو بوہری فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پتلون' شیروانی اور کالی ٹوپی پہنتے تھے۔ ان کے بعد کے آئی تھامس پرنسپل مقرر ہوئے جو کرسچین تھے۔ دونوں صاحبان علم اپنی شخصی وجاہت اور منصبی اطوار کے لحاظ سے قابل احترام اور قابل توجہ خیال کئے جاتے تھے۔

بچپن ہی سے مجھے انگریزی زبان سیکھنے اور بولنے کا شوق رہا ہے۔ اس سلسلے میں والد محترم مدد کیا کرتے تھے۔ چھٹی جماعت ہی سے میں نے روزنامہ ڈان کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ جس لفظ کی سمجھ نہ آتی' والد صاحب سے پوچھ لیا کرتا۔ والد صاحب نے اخبار کا اداریہ پڑھنے کا مشورہ دیا۔ سو میں نے باقاعدگی سے "ڈان" کا ایڈیٹوریل پڑھنا شروع کر دیا۔ ان دنوں میں ساتویں' آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ایڈیٹوریل میں مشکل الفاظ استعمال ہوتے' جن کی مجھے

سمجھ نہ آتی۔ میری اس مشکل کے پیش نظر میرے والد نے مجھے ڈکشنری لے کر دی۔ میں نے ایک کاپی بنائی۔ اس میں وہ تمام انگریزی کے الفاظ لکھتا جن کی مجھے سمجھ نہ آتی۔ ڈکشنری سے ان الفاظ کے معنی دیکھ کر کاپی میں لکھتا اور پھر ان کو جملوں میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا۔ انگریزی پڑھنے اور بولنے کا بہت شوق تھا سکول کے چند لڑکوں نے فیصلہ کیا کہ ہم آپس میں انگریزی بولیں گے۔ جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی آتی، ہم بولتے تھے۔ ایک دوسرے کی اصلاح بھی کرتے۔ ہمارے گروپ میں اگر کوئی لڑکا انگریزی کے بجائے سندھی میں گفتگو کرتا تو اسے جرمانہ کیا جاتا۔ اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ہم انگریز بننا چاہتے تھے یا اپنی زبان سے نفرت تھی۔ چونکہ ان دنوں ہم انگریزی پڑھا کرتے تھے، اس لئے ہمارا مقصد تھا کہ اس زبان کو زیادہ سے زیادہ سیکھا اور پڑھا جائے۔ اس کا ہمیں بہت فائدہ ہوا۔ ہم میں انگریزی زبان بولنے کا حجاب ختم ہو گیا۔ ہماری روزمرہ کی اس انگریزی زبان کی گفتگو کی بنا پر سکول کے زمانے ہی میں ہم کسی غیر ملکی سے بھی بلا جھجک انگریزی میں گفتگو کر لیا کرتے تھے۔

میں کلاس میں سب سے آگے بیٹھتا تھا۔ کبھی بھی کسی پیریڈ سے غیر حاضر نہیں ہوا کرتا تھا۔ کام چور نہیں تھا۔ کوئی بات کہنی ہوتی تو پرنسپل کے کمرے میں بھی شوق سے جایا کرتا۔ پرنسپل کرسچین ہونے کی بنا پر زیادہ تر انگریزی زبان میں گفتگو کرتے۔ میں پرنسپل سے انگریزی میں گفتگو کرتا تو وہ حیران ہوتے کہ اتنا چھوٹا ہونے کے باوجود انگریزی میں بلا جھجک گفتگو کرتا ہوں۔

کلاس کا مانیٹر بننے کی میری بھی کوشش ہوتی بلکہ میں عام طور پر اپنی

کلاس کا مانیٹر ہوتا۔ سکول کے زمانے میں عام درسی کتب کے علاوہ دوسری معلوماتی اور علمی کتابوں کی جستجو بھی میرا مطالعاتی مشغلہ رہا ہے۔ میں انہیں بھی اپنے زیر مطالعہ رکھتا۔ ہمارے علاقے سے ایک اخبار ''ناخدا'' شائع ہوتا تھا میں اس اخبار میں مضامین لکھا کرتا تھا۔

تقریریں کرنے کا بھی شوق تھا۔ سکول میں ڈیبیٹنگ سوسائٹی قائم کر رکھی تھی۔ انگریزی زبان میں زیادہ توجہ دینے کی بنا پر ریاضی میں فیل ہو گیا۔ 100 میں سے بمشکل 28 نمبر ہی حاصل کر پایا۔ میرے والد نے جب رپورٹ دیکھی تو مجھ سے پوچھا کہ تم ریاضی میں کیوں فیل ہو گئے ہو؟ ہمارے سکول میں ہر تین ماہ بعد ٹسٹ ہوتا تھا۔ میں نے کہا۔

''بابا! تین ماہ بعد جو ٹسٹ ہو گا' اس میں ریاضی میں سو میں سے سو نمبر حاصل کروں گا''

وہ میری یہ بات سن کر مسکرائے اور کہا ''33 نمبر تم لے نہیں سکے۔ تین ماہ بعد 100 میں سے 100 نمبر کیسے حاصل کر لو گے'' والد صاحب کے اس جملے نے مجھ میں سخت محنت کا ایک طوفان پیدا کر دیا۔

تین ماہ میں نے اس قدر محنت کی کہ میرے ریاضی میں 100 میں سے 100 نمبر آئے۔ میرا نظریہ بلکہ ایمان ہے کہ اگر آپ محنت کریں اور کسی کام کا عہد کر لیں تو اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرتا ہے۔ ایمانداری اور دیانت داری سے محنت کرنے والا شخص ضرور منزل تک پہنچتا ہے۔

فرانس کو آزادی دلانے والا اور دنیا بھر کے مانے ہوئے جرنیلوں میں اپنی ہمت اور جواں مردی کا لوہا منوانے والے نپولین بوناپارٹ کا قول ہے کہ

کوئی بھی چیز ناممکن نہیں۔ ''ناممکن'' کا لفظ اس کی ڈکشنری میں نہیں تھا۔ میں اس قسم کے جملے اپنی ڈائری میں لکھ لیا کرتا تھا۔ اس طرح مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں ریاضی کے مضمون میں اپنی کلاس میں موجود تمام طلباء سے آگے نکل گیا۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی میرے ٹیچر کہا کرتے کہ تم کلاس لو۔ ان کے اس جملے نے میرے اندر آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ میں پانچویں میں چھٹی جماعت کی ریاضی کی کلاس اٹنڈ کیا کرتا۔ اس طرح میں نے اپنے اندر اعتماد کی نئی دنیا آباد کی۔

ابتداء میں مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ میٹرک پاس کیا تو فرسٹ ائر (سائنس) میں داخلہ لیا۔ کیمسٹری، باٹنی، ریاضی سبھی مضامین میں بہت اچھا تھا۔ البتہ فزکس کا مضمون مجھے پسند نہیں تھا۔ بعد ازاں میں نے سائنس کو چھوڑ کر آرٹس کے مضامین رکھ لئے۔ آرٹس کے مضامین میں جغرافیہ مجھے بور مضمون لگتا تھا۔ میرا پسندیدہ مضمون ہسٹری تھا۔ ان دنوں انگریزی کے علاوہ آرٹس کے باقی مضامین مادری زبان میں بھی حل کرنے کی اجازت تھی مگر میں تمام مضامین کے جواب انگریزی میں تحریر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ عجیب صورتحال پیدا ہو گئی۔ میں نے فقہ کے پرچہ کے جواب بھی انگریزی میں لکھ دیئے فقہ کے ٹیچر نے کہا کہ تم نے فقہ کا پرچہ کے جواب انگریزی میں کیوں تحریر کئے ہیں۔ میرا ذہن ٹیکنیکل بہت ہوتا تھا۔ میں نے ٹیچر کو جواب دیا کہ پیپر میں تحریر تھا کہ ''آپ کسی بھی زبان میں جواب تحریر کر سکتے ہیں'' انہوں نے کہا ''آپ درست کہتے ہیں مگر میں انگریزی نہیں سمجھتا' لہذا آپ کا پیپر کیسے

چیک کروں گا؟ پھر یہ ہوا کہ میرا پیپر پرنسپل کو بھیج دیا گیا۔ پرنسپل کو بھی میں نے وہی جواب دیا جو ٹیچر کو دیا تھا۔ پرنسپل نے کہا کہ آپ کا موقف درست ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مولوی صاحب کو انگریزی نہیں آتی۔ وہ آپ کا پیپر کیسے چیک کریں گے۔ چنانچہ میرا پیپر پرنسپل نے چیک کیا۔ تو اس قسم کی باتیں بچپن ہی سے میری سرشت میں تھیں کہ اگر میں رولز کے مطابق چل رہا ہوں تو بچپن میں بھی سٹینڈ لے لیا کرتا تھا۔

ففتھ سٹینڈرڈ میں ہمارے ایک انگلش کے نئے ٹیچر آئے انگریزی میری شروع ہی سے بہت اچھی تھی۔ انگریزی میں میری عام طور پر پہلی یا دوسری پوزیشن ہوا کرتی۔ یہ جو نئے ٹیچر آئے۔ انہوں نے انگریزی کے پرچے دیکھے تو مجھے فیل قرار دے دیا۔ میں بہت پریشان ہوا۔ میں نے انگریزی کا پرچہ نکلوایا۔ میں نے تمام سوالات کے جواب درست تحریر کئے تھے۔ انگریزی ٹیچر کے مطابق میرا Punctuations (اعراب نگاری) درست نہ تھا۔ یعنی عبارت میں خامیاں تھیں۔ میں نے مذکورہ ٹیچر سے کہا کہ اگر عبارت میں خامیاں تھیں تو آپ دو چار نمبر کم کر دیتے۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہئے تھا کہ مجھے فیل کر دیا جائے اور ایک نمبر بھی نہ دیا جاتا۔ اس صورتحال سے میرے کلاس فیلوز بھی پریشان تھے انہیں علم تھا کہ میں انگریزی میں پہلی یا دوسری پوزیشن حاصل کرتا رہا ہوں۔ میں نے اس سلسلے میں پرنسپل سے بات کی۔ انہوں نے میرا انگریزی کا پیپر نکلوا کر چیک کیا اور کہا کہ تم نے جواب صحیح تحریر کئے ہیں۔ جہاں تک Punctuations کا مسئلہ ہے تو اس کے نمبر کاٹ لئے جاتے' نہ کہ تمہیں فیل کیا جاتا انہوں نے انگریزی کے ٹیچر کو بلایا اور باز پرس کی۔ ٹیچر نے

اس بات کو اپنی توہین تصور کیا کہ طالب علم کی موجودگی میں ان سے پوچھ تاچھ کی جارہی ہے۔ مذکورہ ٹیچر نے کہا کہ میں استعفیٰ دینے کو تیار ہوں اور آپ انگریزی کا دوسرا ٹیچر لے آیئے۔ پرنسپل نے سوچا کہ اچھے ٹیچر روز روز نہیں ملتے کہیں ایسا نہ ہو کہ بات بڑھ جائے اور سکول ایک اچھے ٹیچر سے محروم ہو جائے۔ اگر یہ استعفیٰ دے کر چلے گئے تو فوری طور پر انگریزی کا نیا ٹیچر کہاں سے لائیں گے اور پھر اس سے مفت میں سکول کی بدنامی کا خطرہ بھی مول لینا پڑتا۔ پرنسپل نے کوشش کی کہ میں اپنے نقطہ نظر کو واپس لے لوں مگر میں اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ میں نے پرنسپل سے کہا کہ یہ میرے استاد ہیں۔ میں ان سے معافی مانگنے کو تیار ہوں مگر اپنے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دوں گا۔ ٹیچر کے کہنے پر پرنسپل نے میرا پیپر خود چیک کیا اور انہوں نے مجھے انگریزی میں پاس قرار دے دیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ٹیچر سے معافی مانگی۔ یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بچپن ہی سے اپنے حق کے لئے ڈٹ جایا کرتا تھا اور ڈٹ جانے والی اسی عادت نے مجھے ساری عمر بڑی بڑی آزمائشوں میں ڈالے رکھا مگر ہر بار میرا عزم آہنی رہا۔ دراصل میرا تعلق ہی ایسے قبیلے سے تھا جو خطرات میں بھی سچ بات کہنے سے گھبراتے نہیں ہیں۔

حق بات سر دار کہے اپنا قبیلہ
ہو موت مقابل بھی تو سوچا نہیں کرتے

جب میں ہائی سکول کا طالب علم تھا تو ایک مرتبہ ہمارے سکول میں حاجی مولا

بخش سومرو تشریف لائے۔ یہ اس زمانے میں وزیر تعلیم تھے۔ تقسیم انعامات کی سالانہ تقریب تھی۔ جب میرا نام پکارا گیا مجھے "ریگولیڑی پرائز" کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ یہ کیا پرائز ہے۔ میں انعام لے کر واپس آیا تو مجھے بتایا گیا کہ پانچ برسوں کے دوران میں نے ایک پیریڈ بھی مس نہیں کیا تھا کبھی سکول سے ناغہ کیا اور نہ کبھی لیٹ ہوا۔ آپ اس سے سکول میں میری باقاعدگی کا انداز الگا سکتے ہیں۔

میں نے 1951ء میں میٹرک کا امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ میٹرک کے بعد ڈی جے سائنس کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ فرسٹ ائر کا امتحان سائنس مضامین میں پاس کیا۔ سیکنڈ ایئر میں بیمار ہو گیا۔ ٹائیفائڈ کے شدید حملے نے مجھے مکمل طور پر بستر سے لگا دیا اور یوں پڑھنے کی میری باقاعدہ سرگرمیوں میں تعطل آگیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ میں ایک برس تک امتحان میں شامل ہونے سے قاصر رہا۔ پھر میں نے سائنس کے بجائے آرٹس کے مضامین انتخاب کر لئے۔ پہلے میں نے ڈاکٹر بننے کے بارے میں سوچا ازاں بعد خیال آیا کہ ڈاکٹر بن کر کامیاب زندگی نہیں گزار سکوں گا۔ سیکنڈ ایئر آرٹس میں کیا۔ آرٹس میں میرے مضامین ہسٹری اور پولیٹیکل سائنس تھے۔ یہ دونوں مضامین مجھے ہمیشہ زیادہ عزیز رہے ہیں۔ بی اے میں لکھنا پڑھنا کم کر دیا تھا اس لئے تھرڈ ڈویژن آئی۔ بی اے کا امتحان ایس ایم کالج سے پاس کیا۔ 1956ء میں گریجویشن کرنے کے بعد قانون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن چلا گیا۔ وہاں سے 1959ء کو لنکن ان سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ لندن میں قیام کے دوران شاعر مشرق کی طرح میرے مطالعے میں بہت وسعت آگئی اور میں نے

وطن اور اہل وطن کے بارے میں زیادہ سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ نئے خیالات کو خوش آمدید کہنے اور قومی زندگی کے بارے میں اجتماعی سوچ کو سامنے رکھ کر کچھ کرنے کی خو پیدا کرنے کا زمانہ تھا۔ میرے اندر ایسے فولادی جذبے نمودار ہونے شروع ہو گئے تھے کہ میرا دل ہر مشکل کو آسان بنانے کے لئے تڑپ اٹھتا تھا۔ عالمی سطح پر جن نظریات کو فروغ مل رہا تھا ان کے مطالعے سے مجھے قومی سیاست اور تاریخ کا نیا شعور عطا ہوا۔

ادب سے لگاؤ

سکول کے زمانے ہی میں مجھے شاعری کی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ حسن اتفاق کی ایک مثال یہ بھی تھی کہ مجھے قدرت نے ایسے ماحول میں پروان چڑھایا تھا جو ادبی ماحول کہلاتا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ میرے والد صاحب کو علمی کاموں سے خاص رغبت تھی اور ان کا مطالعاتی شوق سارے خاندان میں مشہور تھا۔ اگرچہ اس ادبی ماحول سے ابھرنے والے شعرا قومی سطح پر کوئی نمایاں پہچان حاصل نہ کر سکے مگر اپنے وقت میں اور اپنی علاقائی نسبت کی بنا پر جن شعرا کو اکثر سننے کا اتفاق ہوا ہے ان میں یوں تو کئی نام تھے مگر عبدالحلیم جوش، محمد مجروح، عبدالعزیز بیدل اور محمد جمن حالا چند نام ہیں جو اس وقت یاد کے نہاں خانے میں محفوظ رہ سکے ہیں۔

میں نے رفتہ رفتہ ان شاعروں کی ادبی رفاقت میں بیٹھنا شروع کر دیا تھا تاکہ میں ان سے کچھ حاصل کر سکوں۔ میں والد کے ہمراہ اکثر سیر کے لئے جاتا، مقصد یہ ہوتا تھا کہ تفریح کے ساتھ ساتھ والد سے علم کی باتیں سیکھ سکوں۔ شاید میرے ذہن اور لاشعور میں یہ بات جاگزیں تھی کہ "مہد سے لحد تک علم حاصل کرو۔"

میں والد کے ہمراہ سینما میں فلم دیکھنے بھی جایا کرتا ابتدا میں اردو فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔ جب انگریزی زبان سے میری واقفیت ابتدائی مرحلوں سے آگے بڑھی تو میں نے انگریزی فلمیں دیکھنا شروع کر دیں۔

میری یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتیں جو میری عمر کے بچوں کو اس وقت یاد نہیں رہتی تھیں، مجھے یاد تھیں۔

میں شعر نہیں کہتا تھا مگر شاعروں کی مصاحبت میں "بیدار" تخلص رکھ لیا تھا۔

اس زمانے میں بعض اخبارات اور جرائد میں میرے تحریر کردہ مضامین "سجاد علی شاہ بیدار" کے نام سے شائع ہوتے تھے اردو، انگریزی اور سندھی تینوں زبانوں میں مضامین لکھا کرتا جو زیادہ تر بچوں کا جنگ اور "نونہال" میں شائع ہوتے تھے۔ مشاعروں میں اپنے شاعر دوستوں کے ہمراہ شرکت کرتا مگر شعر کبھی نہ سنائے۔ جب میں سکھر میں سیشن جج تھا تب سندھی کے مماز شاعر اور دانشور شیخ ایاز سے ملاقات ہوئی تھی۔

سکول کی ادبی سوسائٹی میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔ ڈرائنگ سے بھی دلچسپی رہی۔ میں نے ایک مرتبہ بڑی ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ پنسل سے قائداعظم کا سکیچ بنایا تھا۔ قائداعظم میرے ہیرو تھے اور ہیں۔ اگر مصوری میں سنجیدگی اختیار کرتا تو آج اچھا مصور بھی ہوتا۔

میرے ایک ٹیچر نور محمد تھے۔ جو بڑے اچھے شاعر بھی تھے وہ اکثر ہمیں اپنی شاعری سناتے تھے۔ ان کے کئی شعر مجھے کافی عرصے تک ازبر رہے ان سے اکثر شاعری پر گفتگو ہوا کرتی۔

ہائی سکول ہی میں مجھے ادبی کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ میرے پسندیدہ موضوعات مختلف تھے۔ بالکل میرے مزاج کی مختلف کیفیات کی طرح افسانہ، ناول، تاریخ، سیاست، مذہب، جس موضوع پر بھی اچھی کتاب نظر آجاتی میری کوشش ہوتی کہ پہلی ہی فرصت میں پڑھ ڈالوں۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ ہمارے ہاں پہلے ہر فری ڈے کو اور اب ہر سنڈے کو پاکستان کے بڑے شہروں خصوصاً کراچی، لاہور اور راولپنڈی میں مطالعے کے شوقین خواتین حضرات کے لئے فٹ پاتھ پر کتب فروشی کے سٹال لگائے جاتے ہیں۔ ہمارے نوجوانی کے زمانے میں بھی ایسا ہی ہوتا تھا لہذا میں بھی اپنے چند دوسرے علم دوست دوستوں کے ساتھ فٹ پاتھ سے انگریزی ناول خرید کر پڑھا کرتا تھا۔ ان ناولوں کی موضوعات کے لحاظ سے کئی قسمیں تھیں مگر میں زیادہ تر جاسوسی ناول پڑھتا۔ اردو میں ایم اسلم اور نسیم حجازی کے ناولوں کا مطالعہ کرتا کیونکہ یہ دونوں ناول نگار میرے پسندیدہ تھے۔

شاعری میں میرے پسندیدہ شعرا میں علامہ اقبال اور غالب شامل تھے۔ شورش کاشمیری کا کلام بھی بہت پسند تھا۔ ان کی انقلابی شاعری سے بہت استفادہ کرتا تھا۔ ان کی نظم ہے

جاگیردار

اے کلن...... وہ لڑکی کون ہے برگد کی چھاؤں میں
زبیدہ ہے...... ؟اُسی کے حسن کا چرچا ہے گاؤں میں

زبیدہ...... ؟ ٹھیک اُس نورا بہشتی کی نواسی ہے
اجی سرکار والا! آپ کے چرنوں کی داسی ہے
اجازت ہو تو دن چھپتے ہی ڈیرے پر بلا لاؤں
بھلا انکار اور وہ، رات کو گھر سے اٹھا لاؤں
ارے توبہ جوانی، ہیچ اور رنگِ جم و کے ہے
یہ چودہ سال کے پیٹے میں ہے لیکن بڑی شے ہے
صبا کا لوچ ہے آوازۂ شمشیر ہے شاید
ہمارے گاؤں میں اک جانشین ہیر ہے شاید
بہشتی کو ابھی حاضر کرو، دربار میں لاؤ
زبیدہ کو سرِ شام آج ہی سرکار میں لاؤ
میں اس کے چمپئی چہرے کی زیبائی سے کھیلوں گا
میں اس کی کندنی بانہوں کی برنائی سے کھیلوں گا
میں ہوں جاگیر کا مالک مجھے سردار کہتے ہیں
مجھے اس گاؤں کے خورد و کلاں سرکار کہتے ہیں
مری بستی کی دہقاں زادیوں کا حسن بالا ہے
انہیں میرے تعیش کے لئے فطرت نے پالا ہے

شورش کاشمیری نے اپنی مذکورہ بالا نظم میں کہا ہے کہ ایک جاگیردار نے گاؤں کے کسی کمی کمین کی بیٹی کو دیکھا ہے۔ وہ اپنے ملازم سے پوچھتا ہے کہ یہ لڑکی کون ہے۔ ملازم جواب میں کہتا ہے کہ آپ کے چرنوں کی داسی ہے۔

میں یہ باتیں 1950ء کی کر رہا ہوں۔ ہم نوجوان اس قسم کی انقلابی شاعری پڑھا کرتے تھے۔ میں ہر وقت سچ کی تلاش میں رہتا ہوں۔ ہمیشہ سچ بولا ہے۔اس کے لئے مجھے نقصان بھی برداشت کرنا پڑا۔ مگر میں نے نقصان کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اس دنیا میں خاص طور پر پاکستان میں سچ بولنے سے انسان Suffer کرتا ہے۔اگر آپ جھوٹ بولیں تو فائدے ہی فائدے ہیں۔ بلھے شاہ نے بھی تو کہا ہے ؎

سچ سن کے لوک نہ سہندے نیں
سچ آکھیے تے گل پیندے نیں
پھر سچے پاس نہ بہندے نیں
سچ مٹھا عاشق پیارے نوں

ہم تو سچ کے پرچارک ہیں۔
سچ کے بارے میں شیخ ایاز کی نظم ہے

سچ نوں
بدل سکئے یاں نہیں
اوہناں
اکھاں نوں
بدلنا وسوں باہر
جھڑیاں

سچائی نوں ویکھدیاں

(سندھی سے ترجمہ)

حبیب جالب کی شاعری بھی بہت پسند تھی۔ ان کی شاعری بھی انقلابی ہے۔ حبیب جالب کی کوئی شعری کتاب آج بھی میرے مطالعے میں آئے تو مجھے خوشی ہوتی ہے۔

ازدواجی زندگی

میں نے لو میرج نہیں کی بلکہ یہ ارینجڈ میرج تھی۔ ہمارے علاقے میں ایک فوٹو گرافر کی خواہش تھی کہ ہماری شادی کی تصویریں وہ بنائے۔ میں نے اسے تصویریں اتارنے کی اجازت دے دی۔ کسی اور فوٹو گرافر سے میں نے نہیں کہا تھا لہذا وہ واحد فوٹو گرافر تھا جس کو اس مقصد کے لئے مدعو کیا گیا۔ شادی کے بعد جب تصویریں لینے کے لئے کسی عزیز کو بھجوایا تو پتہ چلا کہ گزشتہ کئی روز سے اس کی دکان بند ہے۔ جب ادھر ادھر سے معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ اس کے کیمرے میں کسی فنی خرابی کی وجہ سے ہماری کوئی بھی تصویر نہ بن پائی۔ جس کا مجھے اور ساری فیملی کو بہت افسوس ہوا۔ ہماری شادی میں اہم شخصیات نے شرکت کی تھی۔ فوٹو گرافر شاید اس خوف سے علاقہ چھوڑ گیا کہ ہم اس پر سختی نہ کریں ہم (میاں بیوی) نے سٹوڈیو میں جا کر تصویر بنوائی تھی۔

میری شادی میں جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں طفیل عبدالرحمٰن سندھ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ بعد میں سندھ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے۔ عبدالحفیظ پیرزادہ کے والد عبدالستار پیرزادہ بھی شریک ہوئے۔ یہ وفاقی وزیر رہے ہیں۔ چونکہ میرے والد سندھ ہائی کورٹ میں ملازم تھے اس

لئے ججوں اور وکلاء نے کثیر تعداد میں شرکت کی تھی۔

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ ہم میاں بیوی کا شادی سے لے کر آج تک کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ میں بسلسلہ ملازمت مختلف شہروں میں تعینات رہا۔ میری بیوی اور بچے کراچی ہی میں مقیم رہے۔ بچوں کی تعلیم اور پرورش کی ذمہ داری میری اہلیہ پر تھی۔ انہوں نے آج تک شکایت کا موقع ہی نہیں دیا تو جھگڑا کس بات کا! میری تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ سیما ہماری بڑی بیٹی ہے۔ منجھلی بیٹی کا نام انیلہ اور چھوٹی بیٹی کا نام سعدیہ ہے۔ بیٹا محمد علی ایم بی اے کا سٹوڈنٹ ہے۔

میری طرح میری اولاد بھی مشکل حالات سے نبھا کرنے میں بلند ہمت ثابت ہوئی ہے۔ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں میری بڑی صاحبزادی سیما کے گھر پولیس اہلکاروں نے حملہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح کے حربوں سے ہمارا خاندان ڈر جائے گا مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم ہر حال میں سچائی کے ساتھ رہے۔ میری کامیابیوں میں میری اہلیہ کی معاونت اور حوصلہ افزائی کا بہت عمل دخل ہے۔ میں دس بارہ برس سیشن جج رہا۔ اس دوران مختلف اضلاع میں تعینات رہا۔ مثلاً سکھر، جیکب آباد، بہاولنگر، نواب شاہ اور حیدر آباد وغیرہ۔

صرف اسلام آباد اور حیدر آباد میں فیملی کو ساتھ رکھا۔ اتنے بہت سے شہروں میں کام کے دوران ظاہر ہے میری عدالتی مصروفیات مسلسل رہی ہیں مگر مجھے ایسا کوئی بھی دن یاد نہیں ہے جب میں گھریلو سطح پر کسی ذہنی الجھن یا دباؤ کا شکار رہا۔ یہ کریڈٹ میری اہلیہ کو جاتا ہے جس نے میری ضرورتوں کے

ساتھ ساتھ میرے سماجی رتبے اور شخصی وقار کو برقرار رکھنے میں ایک نیک
سیرت اور بلند کردار خاتون ہونے کا ثبوت دیا۔

بطور وکیل

1960ء میں میری ہائی کورٹ کے وکیل کی حیثیت سے رجسٹریشن ہوئی جس کے بعد کراچی میں قانون کی پریکٹس شروع کر دی۔ 1967ء تک وکالت کی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا ٹمپرامنٹ اس قسم کا ہے کہ میں بطور وکیل کامیاب نہ ہو سکوں گا۔ فیس وغیرہ لینے کے معاملات میں بھی میں شرمیلا واقع ہوا تھا۔ میں شروع ہی سے قانون کی حکمرانی کا قائل رہا ہوں۔ بطور وکیل جب عدالتوں میں پیش ہوتا تو مجھے صورتحال دیکھ کر کوفت ہوتی۔ دوسرے وکیل ایڈجسٹ کر لیتے تھے۔ میں اس ماحول میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہ کر پایا۔

میں نے اس وقت ارادہ کر لیا کہ میں جج بنوں گا۔ میں نے ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے لئے درخواست دی۔ 1967ء میں براہ راست ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کے عہدے پر میرا تقرر ہوا۔ میں نے میرٹ پر یہ عہدہ حاصل کیا۔ بطور ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کا زمانہ مجھے بہت اچھا لگا۔ ون یونٹ کے دوران پنجاب کے مختلف اضلاع میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ ون یونٹ کے ختم ہونے کے بعد مجھے سندھ میں تعینات کیا گیا۔ محدود تنخواہ تھی۔ اس زمانے میں سینئر بی ایس پی سکیل تھا۔ بطور سیشن جج

میری تنخواہ 850 روپے تھی اس زمانے میں پیسے کی ویلیو بہت تھی۔ 850 روپے میں بھی ٹھیک ٹھاک گزارا ہوتا تھا۔ مجھے تنخواہ کے علاوہ مزید پیسوں کی کبھی ضرورت نہ پڑی۔ میری فیملی کراچی میں تھی۔ اس کو پیسے بھیجتا تھا تنخواہ میں سے تین سو روپے اپنے پاس رکھتا تھا۔ اس زمانے میں ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج کی سطح پر کافی کیسوں کا فیصلہ کیا۔

بطور جج

1978ء میں مجھے سندھ ہائی کورٹ کا جج تعینات کیا گیا جب مارشل لاء عروج پر تھا جج کے فرائض کے ساتھ ساتھ مجھے کسٹوڈین متروکہ املاک' چیئرمین انسداد دہشت گردی عدالت (سپیشل کورٹس) چیئرمین سپیشل اپیلٹ کورٹ (کسٹمز) اور صوبائی الیکشن اتھارٹی کی اضافہ ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

1989ء میں کچھ عرصہ کے لئے سندھ ہائی کورٹ کا قائم مقام چیف جسٹس رہا۔ اسی سال ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ سنبھال لیا۔ 10 ماہ تک سندھ ہائی کورٹ کا چیف جسٹس رہا۔ پھر مجھے سپریم کورٹ بھیج دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے کسی سیاست دان کو Relief دیا تھا۔

1992ء میں سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔

رنگین مزاجی

میں جوانی میں رنگین مزاج نہیں تھا۔ گو کوایجوکیشن تھی لڑکیوں سے ملاقاتیں رہتیں مگر Affair کسی سے نہیں تھا۔

ڈی جے سائنس کالج میں عبدالحفیظ پیرزادہ میرے کالج فیلو تھے۔ ظفر علی شاہ، رانا اظہر علی خان بھی میرے کلاس فیلو رہے ہیں۔ ان رومانوی موضوعات پر کہ جنہیں سن کر اکثر نوجوانوں کے چہرے گلنار ہو جاتے ہیں جب میں سنتا تو جانے کیوں حجاب سا محسوس کرتا تھا شاید اس کی ایک بڑی اور اہم وجہ اس ماحولیاتی پس منظر کی تھی جس نے میرے بچپن سے جوانی تک کے رومان پرور عہد کو سنجیدگی کی دھند میں لپیٹ دیا تھا۔ میں چونکہ شروع ہی سے نہایت سنجیدہ طالب علم کی حیثیت سے اپنے اردگرد میں پروان چڑھنے والے طالب علموں میں بہت نمایاں تھا لہذا اندر کے لاشعوری خوف نے اس رنگین مزاجی کو ہمیشہ پردوں میں چھپائے رکھا جو عنفوان شباب کا خاصا ہوتی ہے اور اب جب بیتی یادوں پر غور کرتا ہوں تو سوچتا ہوں شاید یہی میرے حق میں بہتر تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی

جہاں تک ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی کا تعلق ہے تو اس بارے میں بتاتا ہوں۔ میں جب سیشن جج تھا تو ایسے اضلاع میں تعینات رہا ہوں' جہاں قتل کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں جس کے ایما پر قتل ہوتا ہے' اس کو سزا کم اور جو قتل کرتے ہیں' انہیں زیادہ سزا دی جاتی ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی سزا کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ سپریم کورٹ کے 9 ججوں پر مشتمل فل کورٹ نے اس مقدمہ کو سنا۔ اس دوران جسٹس قیصر علی خان ریٹائر ہو گئے۔ اب جج 8 رہ گئے۔ جسٹس وحید الدین کو دماغی فالج ہوا اور وہ اسی بیماری سے وفات پا گئے۔ اب سپریم کورٹ میں کل سات جج رہ گئے۔ جس کے نتیجے میں 4 جج چیف جسٹس شیخ انوار الحق' جسٹس محمد اکرم' جسٹس کرم الٰہی چوہان اور جسٹس نسیم حسن شاہ نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو قائم رکھا۔ جبکہ 3 جج صاحبان جن میں جسٹس محمد حلیم' جسٹس غلام صفدر شاہ اور جسٹس دراب پیٹل نے ذوالفقار علی بھٹو کو بری کر دیا۔ تین ججوں کی رائے کا احترام کرتے ہوئے باقی چار جج یہ فیصلہ کر سکتے تھے کہ سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیتے۔ اس طرح ان کی زندگی بچ جاتی۔ بہر کیف جو کچھ بھی ہوا' وہ قابل افسوس تھا۔

آپ دیکھیں کہ فوجی عدالتیں قائم ہوئیں، سپریم کورٹ نے ان عدالتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا تو ملٹری کورٹس کے تحت جن افراد کو سزائے موت ہوئی ان کا کون ذمے دار ہے۔ وزیر اعظم، وزیر قانون سب ذمے دار ہیں، جنہوں نے یہ قانون بنایا۔

لندن میں قیام

لندن میں بھی میری تمام توجہ حصول علم پر ہوتی تھی۔ آوارہ گردی نہیں کی۔ اگرچہ مجھ پر وہاں بزرگوں کی یا سرکار کی جانب سے کوئی پابندی نہیں تھی جہاں چاہتا گھوم سکتا تھا۔ عیاشی کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ سکتا تھا مگر تربیت ہی ایسے خاندانی ماحول میں ہوئی تھی کہ مادر پدر آزادی سے کوسوں دور رہا۔ صبح سے رات آٹھ بجے تک لائبریری میں مطالعہ کرتا۔ کلاسیں باقاعدہ اٹنڈ کرتا۔ مجھے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ والدین نے حصول تعلیم کے لئے بھیجا ہے لہذا میں تعلیم حاصل کر کے جلد وطن لوٹ جاؤں۔ میں نے بہت محنت کی۔ گھومتا پھرتا بھی تھا مگر صاف ستھرے مقامات پر۔ میں نے ہمیشہ گول کو سامنے رکھا۔ میں دوستوں کے ہمراہ کبھی کبھار کلب بھی جاتا مگر کبھی کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں کی۔ بہت سے لڑکے جو ہمارے ساتھ حصول تعلیم کے لئے گئے تھے اپنی اقدار اور تہذیب کو بھول گئے۔ اکثر نے وہیں شادیاں کر لیں اور وہاں رہ گئے۔ وطن سے دوری کا احساس مجھے ہر دم رہا۔ اس بات کا احساس اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب کوئی شخص اپنی کسی عزیز چیز سے جدا ہوتا ہے۔ وطن سے دور رہ کر اس کی سلامتی اور خوشحالی کی فکر رہتی ہے یہاں کے حالات جاننے کے

لئے بے تاب رہتے تھے۔ اس زمانے میں پاکستان سے بہت کم اخبارات پہنچتے تھے۔ دوستوں اور عزیزوں کے خطوط سے وطن کے حالات سے آگاہی حاصل ہوتی رہتی تھی۔

میں جس گیسٹ ہاؤس میں مقیم تھا۔ وہاں نچلی منزل پر سیڑھیوں کے ساتھ لکڑی کی ایک میز تھی۔ ہاؤس کیپر تمام لڑکوں کی ڈاک اس میز پر رکھ دیا کرتی تھی۔ میں پہلی منزل پر رہتا تھا۔ جب بھی پاکستان سے خط آتا اس کے مخصوص رنگ کی وجہ سے مجھے اوپر ہی سے خط نظر آجاتا تھا۔ حالات جاننے کے لئے اتنی بے تابی ہوتی تھی کہ میں دو دو تین تین سیڑھیاں پھلانگتا نیچے آتا تھا اور خط لے کر اسی تیزی سے واپس اپنے کمرے میں چلا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ میرے ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ ریڈیو پاکستان سے صبح سویرے فرمائشی نغموں کا پروگرام آتا ہے۔ وطن کے نغمے سننے کے لئے اتنی بے تابی تھی کہ رات کو میں نے ہاؤس کیپر کو بتایا کہ صبح چار بجے مجھے کہیں جانا ہے اگر میرے کمرے سے خلاف معمول بیدار ہونے اور نہانے کی آواز آئے تو وہ پریشان نہ ہو۔ اگلے روز صبح چار بجے اوور کوٹ اور مفلر وغیرہ سے جسم کو اچھی طرح ڈھانپ کر شدید سردی میں اپنے دوست کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں جاکر فرمائشی نغموں کا پروگرام سنا۔ اگلے روز مجھے ہاؤس کیپر نے حیرت سے پوچھا کہ صبح اتنی سردی میں تم کہاں گئے تھے۔ میں نے جب اسے بتایا کہ پاکستانی نغمے سننے دوست کے ہاں گیا تھا تو وہ بہت حیران ہوئی اور کہا کہ یہ پاکستان نہیں ہے۔ اتنی سردی میں صبح باہر نکلو گے تو تمہیں نمونیا ہو سکتا ہے۔ ریڈیو مجھ سے لے کر اپنا شوق یہیں پورا کر لیا کرو۔ اب آپ کو لندن سے واپسی

کا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میں سامان کی پیکنگ کر رہا تھا کہ گلی میں شور سنائی دیا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو ایک عورت زخمی حالت میں پڑی تھی۔ یہ کار کا حادثہ تھا۔ کار تباہ ہو چکی تھی۔ تباہ شدہ کار کو دیکھ کر تعجب ہوا کہ عورت زندہ کیسے بچ گئی ابھی میں عورت کے زخموں کا جائزہ لے رہا تھا کہ کچھ دیر کے بعد پولیس پہنچ گئی۔

پولیس اہلکار نے مجھ سے پوچھا۔ آپ کون ہیں اور کہاں رہتے ہیں میں نے تفصیل بیان کی۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو ہمارے ہمراہ تھانے چلنا ہو گا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں وطن جانے کے لئے اپنا سامان پیک کر رہا ہوں۔ اس لئے آپ کے ہمراہ نہیں جا سکتا۔ ان کا اصرار تھا کہ آپ واحد عینی شاہد ہیں' اس لئے آپ کو تھانے چلنا ہو گا۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں بیرسٹر ہوں۔ بار ایٹ لا کرنے کے بعد اپنے وطن جا رہا ہوں۔ تب انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دی۔ میں حیران ہوا کہ وہاں کی پولیس کس قدر فرض شناس ہے کہ حادثے کے تین چار منٹ بعد جائے حادثہ پر پہنچ گئی۔ ظاہر ہے کسی نے فون کیا ہو گا مگر ہمارے یہاں تو فون کرنے کے گھنٹوں بعد بھی پولیس نہیں پہنچتی۔ بعد ازاں وہ خاتون کو ہسپتال لے گئے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہاں قانون کی حکمرانی ہے اور نظام عدل کامیاب ہے۔

بطور چیف جسٹس

5 جون 1994ء کو چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے کا چارج سنبھالا۔ اس کے ساتھ میں پاکستان لا کمیشن کا چیئرمین' پاکستان جوڈیشل اکیڈمی کا چیئرمین اور سپریم جوڈیشل کونسل آف پاکستان کا چیئرمین کی حیثیت سے بھی فرائض سرانجام دیتا رہا۔

ہر منصبی ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے میری یہی کوشش رہی کہ میں جس حیثیت میں بھی عوام و خواص کے سامنے آؤں' وقار اور سچائی کے ساتھ آؤں۔ میں نے زندگی بھر محنت اور کام کرتے رہنے کو عبادت سمجھا ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اس کا صلہ ملا ہے۔

نظام عدل

ملک میں اگر نظام عدل ہو' عدالتیں صحیح کام کر رہی ہوں تو سسٹم کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ میں نظام عدل کو ترجیح دیتا ہوں۔ کسی ملک میں نظام عدل نہ ہو' وہاں سسٹم فیل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں کرپشن عام ہے۔ ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دینے کا رجحان عام ہے۔ اپنا مطلب نکالنے کے لئے لوگ قومی نقصان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اصولوں پر سمجھوتے کرنے کا رواج مقبول ہو رہا ہے۔ قول و فعل میں تضاد کے مظاہرے ہر جگہ نظر آتے ہیں جھوٹ بہت بولا جاتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں کرپشن ہے۔ اس وقت ہمارے جو حکمران ہیں' یہ تاجر ہیں۔ تاجروں کا کام تجارت کرنا ہوتا ہے۔ یہ سیاست کی تجارت کر رہے ہیں۔ ان حکمرانوں کا کہنا ہے کہ کون ایسا شخص ہے جس کو خریدا نہیں جا سکتا۔ جو شخص خریدا نہیں جا سکتا' اس کے ساتھ یہ جو سلوک کرتے ہیں اس کو دنیا دیکھتی ہے۔

میرے ذہن میں چھوٹی سی فلاسفی تھی جس کو میں نے تمام عمر فالو کیا۔ وکالت کے زمانے سے لے کر چیف جسٹس تک میں قانون کی حکمرانی پر عمل پیرا رہا ہوں۔ عدالت میں بیٹھ کر ہمیشہ انصاف کیا۔ جب مجھے معلوم ہوتا

کہ میں نے صحیح فیصلہ کیا ہے تو بڑی خوشی ہوتی تھی۔ اس سے روح اور ذہن کو سکون ملتا۔ فیصلہ تحریر کرتے وقت میرے ذہن میں ایک ہی بات ہوتی تھی کہ میں نے حشر میں اپنے رب کو جواب دینا ہے اور مخلوق خدا کا وہ قرض جو انصاف کی صورت میں، میرے ذمہ ہے اس کی ادائیگی میں عدل کے تقاضوں سے روگردانی میرے منصب کے خلاف ہے۔

میرے سامنے کوئی ایسا فیصلہ نہیں آیا کہ کسی نے بتایا ہو کہ فیصلہ غلط ہو گیا ہو یا کسی کے ساتھ ظلم ہوا ہو۔ مجھ سے غلطی ہو سکتی ہے مگر ہم نے پولیس کے بیانات اور شواہد کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہوتا تھا۔ زیادتی ہماری جانب سے نہیں بلکہ پولیس اور گواہوں کے بیانات کی وجہ سے ہو سکتی ہے۔ ہمارے سامنے جو شہادتیں آتی ہیں اس کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔

پنشن کا مسئلہ

میں نے اپنی پنشن کے لئے کیس فائل کیا ہے۔ دس ججوں نے فیصلہ دیا ہے کہ آپ کا بطور چیف جسٹس تقرر غیر قانونی تھا لہذا آپ بطور چیف جسٹس پنشن نہیں لے سکتے۔ کوئٹہ بنچ کے اس فیصلے سے قبل میں ساڑھے تین برس چیف جسٹس رہا۔ ساڑھے تین برس انہیں خیال نہ آیا۔ مثال یوں ہے کہ شیرنی چاہے انڈے دے چاہے بچے دے۔ شیرنی کو کون کچھ کہے گا' وہ تو جنگل کے بادشاہ ہیں۔ وہ جو چاہیں فیصلہ دے دیں۔ دس میں سے آٹھ ججز ایسے ہیں جو میرے Consultation سے جج ہوئے تھے۔ میں نے ان سے حلف لیا۔ ساڑھے تین برس ان تمام ججوں نے میرے ساتھ کام کیا۔ اب گورنمنٹ کو خوش کرنے کے لئے کہتے ہیں کہ آپ قانونی طور پر چیف جسٹس نہیں تھے۔ بطور چیف جسٹس میں نے جو فیصلے دیئے ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ ان میں ایک فیصلہ بے نظیر بھٹو کا ہے جو ہم نے دیا تھا۔ اس کے بعد موجودہ حکومت الیکشن کے بعد آئی ہے۔ وہ فیصلے جو ان کے حق میں جاتے ہیں' انہیں تو تسلیم کرتے ہیں یعنی جو فیصلے ان کے حق میں ہوئے ہیں وہ تو Validated ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ میں نے آخری تنخواہ بطور چیف جسٹس وصول کی۔ پھر کیا وجہ ہے

کہ میں پنشن بطور ریٹائرڈ چیف جسٹس وصول نہیں پا سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب دس ججوں کا فیصلہ ہے۔ کیونکہ موجودہ حکومت میرے خلاف ہے' اس لئے یہ صورتحال پیدا ہوئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ مجھے کہہ رہے تھے' آپ نواز شریف کے خلاف کیس نہ سنیں۔ میرا جواب تھا کہ میں Compromise نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کورٹ میں آئیں۔ اگر کیسز غلط ہیں تو میں آپ کو باعزت ان کیسز سے بری کروں گا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ آپ یہ کیس نہ سنیں بلکہ دوسرے دس جج سنیں۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے پسند کے ججوں سے کیس چلوائیں۔ اس طرح تو ہر پارٹی کہہ سکتی ہے کہ میرا کیس فلاں جج سنے' چونکہ وہ میری پسند کا ہے۔

بے نظیر بھٹو سے بھی اسی لئے اختلافات ہوئے تھے کہ حکمران قانون کی حکمرانی نہیں چاہتے بلکہ صرف اپنی حکمرانی چاہتے ہیں۔ یہ لاء کو کچھ نہیں سمجھتے۔ ان کا کہنا تھا کہ قانون ہم بناتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو قانون سے مبرا تصور کرتے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ قانون سب کے لئے یکساں ہیں۔ اس میں تخصیص نہیں۔

بار ایسوسی ایشن کی ایک تقریب وزیراعظم نواز شریف کی زیر صدارت ہوئی۔ اس تقریب میں' میں بھی شریک تھا۔ کچھ وکلاء نے اپنی تقریروں میں کہا ججز کیس میں بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے وزیراعظم سے درخواست کی کہ آپ ججوں کے لئے مراعات کا اعلان کریں۔ مثلاً ان کی ریٹائرمنٹ کی عمر میں اضافہ اور تنخواہیں بڑھا دیں۔

جب میری باری آئی تو میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ جناب وزیراعظم
! یہ مطالبات ہمارے نہیں ہیں۔ وکیلوں نے پیش کئے ہیں۔ ہمیں آپ سے کچھ
نہیں چاہئے۔ ہم نے انصاف کے مطابق فیصلہ کیا۔ ہمیں آپ آزاد چھوڑ دیں۔
ہم صرف اپنے کام میں آزادی چاہتے ہیں۔ اگر رول آف لاء ہے تو آئین بھی
کامیاب ہو گا۔ قانون کی بالادستی آپ کے لئے اور ملک کے لئے بھی اچھی ہے۔
مگر انہوں نے ہماری بات کو غلط سمجھا' پھر جو کچھ بھی ہوا' وہ آپ کے سامنے
ہے۔

سپریم کورٹ پر حملہ

سوال :- 28نومبر 97ء کو سپریم کورٹ پر حملہ ہوا۔ آپ اس بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے کہ یہ حملہ کیوں اور کیسے ہوا۔ آپ نے اس حملے سے خود کو بچانے کے لئے کیا کیا اور چیف جسٹس کی حیثیت سے حملہ آوروں کے خلاف کیا اقدامات کئے ؟

جواب :- اس حملے کے بعد میں نے صدر مملکت فاروق احمد لغاری کو خط لکھا تھا۔ سب سے پہلے خط کی عبارت ملاحظہ فرمائیں۔ اس کے بعد باقی تفصیل بیان کروں گا۔ خط کا متن

"جمعہ 28 اگست کو پارلیمنٹ سے اپنے خطاب میں، جو ٹی وی سے براہ راست نشر ہو رہا تھا، وزیراعظم نواز شریف نے خصوصی طور پر الزام لگایا کہ سابق صدر فاروق احمد خان لغاری اور سابق چیف جسٹس آف پاکستان سجاد علی شاہ کے درمیان ان کی حکومت کو کمزور کرنے کی سازش چل رہی تھی۔ اس سازش نے ان کی توجہ اہم قومی مسائل کو حل کرنے کی طرف مبذول کرائی۔ ملک کی سکیورٹی کے نقطہ نظر سے وہ اس بات کو کئی بار دہرا چکے ہیں۔

اس موقع پر واقعات کے بارے میں میرا نقطہ نظر بھی سامنے آنا

ضروری تھا۔ میرے اور صدر کے درمیان کوئی سازش نہیں چل رہی تھی۔ بات ذرا اٹھا کر کی گئی۔ سازش دراصل وفاقی حکومت اور سپریم کورٹ کے بعض ججوں کے درمیان چل رہی تھی جو حکومت کی بعض ایسی وجوہ کی بنا پر حمایت کر رہے تھے جو قابل فہم ہیں۔

سپریم کورٹ نے معروف ججز کیس میں فیصلہ صادر کیا جس میں لفظ مشاورت معنوی اعتبار سے عام فہم، قابل عمل، بامقصد اور اکثریت کی سمجھ میں آنے والا تھا۔ اس میں یہ بھی قرار دیا گیا کہ ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹسوں کی سفارشات ایسی صورت میں صدر کے لئے قابل قبول ہوں گی جو بعض وجوہ کی بنا پر تحریری شکل میں نہ ہوں جنہیں کسی بھی عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا ہو۔ یہ سپریم کورٹ میں حکومت کی طرف سے ججوں کی سیاسی تعیناتی کو روکنے کے لئے کیا گیا جو ان دنوں لفظ مشاورت کی غلط تشریح کی وجہ سے معمول بن گئی تھیں۔ یہ تقرریاں لفظ مشاورت کی اس تشریح کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ کہ چیف جسٹس حضرات کی سفارشات کا یہ مطلب نہیں کہ حکومت ان کی پابند ہو گئی ہے بلکہ یہ کافی ہے کہ ان کا نقطہ نظر نہیں لیا گیا ہے۔ اس طرح حکومت نے چیف جسٹس کی مخالفت کے باوجود میرٹ کے خلاف صرف سیاسی بنیاد پر ججوں کی تقرریاں کیں۔ حکومت نے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا کہ تقرریاں صرف میرٹ کی بنیاد پر کی جائیں جس سے عدلیہ کی خود مختاری کی حوصلہ افزائی ہو۔ موجودہ حکومت کے اقتدار میں آنے کے فوری بعد سپریم کورٹ اسلام آباد کے احاطے میں بین الاقوامی سطح پر ایک سیمینار ہوا جس میں بھارت کے چیف جسٹس سمیت متعدد ممالک کے ججوں اور ممتاز قانون دانوں

نے شرکت کی۔ سیمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت وزیراعظم نواز شریف نے کی۔اس موقع پر سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر نے اپنی تقریر میں وزیراعظم کی توجہ ججز کیس کے فیصلے کی طرف مبذول کرائی جس میں عدلیہ کی آزادی کا ذکر کرتے ہوئے درخواست کی گئی کہ ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر بڑھائی جائے۔ میں نے اپنے خطاب میں صاف صاف کہا کہ ججوں نے اپنے فرائض قانون کے تقاضوں کے تحت نبھائے ہیں اور وہ حکومت سے کسی قسم کا کوئی مفاد نہیں چاہتے' مگر حکومت سے صرف درخواست ہے کہ وہ عدلیہ کی آزادی کو برقرار رہنے دے۔ میرا خیال ہے کہ وزیراعظم نے میری اس بات سے اچھا تاثر نہیں لیا اور عدلیہ کو شک کی نظروں سے دیکھا۔

میں ہمیشہ اس خیال کا حامی رہا ہوں کہ کوئی بھی سسٹم اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب مختلف اداروں کو آزادی اور ایمانداری سے کام کرنے دیا جائے تاکہ قانون کا بول بالا ہو اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب عدلیہ آزاد ہو۔ یہ عدالتوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ نہ صرف آئین اور قوانین کی تشریح کریں بلکہ مملکت کے دوسرے ستونوں پر بھی چیک رکھیں اور جب اور جہاں کوئی اپنے اختیارات سے تجاوز کرے' اس پر قدغن لگانے کے لئے اپنی ذمہ داری پوری کریں۔ یہ ذمہ داری آئین کے آرٹیکل (2)58بی کے ختم ہونے کے بعد اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے جس کے تحت صدر کو حکومت برطرف کرنے اور اسمبلیاں توڑنے کا اختیار حاصل تھا۔ ایسی صورت میں صدر 90دن کے اندر دوبارہ انتخابات کرانے کے پابند تھے۔ برطرفی کا حکم عدالت میں چیلنج کیا جا سکتا تھا اور اگر یہ حکم کلعدم قرار دیا جاتا تو پھر اس کا آخری اختیار عوام کے

پاس تھا کہ وہ حکومت کو جاری رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ آئین میں یہ آرٹیکل دراصل مارشل لا کا راستہ روکنے کے لئے ایک سیفٹی والو کی حیثیت رکھتا تھا۔ آرٹیکل (2) 58 بی کو ختم کرنے کے بعد آئین میں ایک فلڈ پیدا ہو گیا ہے۔ حکومت آئین کے تحت کام کر رہی ہے یا نہیں' اب اس کا کوئی مواخذہ نہیں۔ سیاستدانوں نے ہمیشہ آزاد عدلیہ کی حوصلہ افزائی کی ہے مگر صرف اس وقت جب وہ اپوزیشن میں ہوں اور محسوس کرتے ہوں کہ انہیں کسی وقت نشانہ بنایا جا سکتا ہے لیکن جب وہ اقتدار میں آتے ہیں تو عدلیہ کی آزادی اور اس کے اعتماد کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جاتے ہیں۔

وزیراعظم نے فیصل آباد میں سرکاری افسروں کی گرفتاری کا حکم دیا جنہیں ہتھکڑیاں لگا کر ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا۔ ان پر واٹر اینڈ سیوریج بورڈ میں گھپلوں اور سرکاری فنڈز میں خوردبرد کے الزامات تھے۔ یہ مقدمہ پرنٹ میڈیا میں بھی بڑے پیمانے پر اچھالا گیا۔ سپریم کورٹ نے از خود اختیارات کے تحت اس کا نوٹس لیا اور ملزموں اور پولیس افسران کو متعلقہ ریکارڈ سمیت طلب کر لیا۔ ملزموں نے موقف اختیار کیا کہ وہ بے گناہ ہیں اور انہیں جھوٹے مقدمے میں ملوث کیا گیا ہے کیونکہ وزیراعظم کا ایک رشتہ دار ان کے خلاف ہے۔ ان حالات میں انہیں عبوری ضمانت پر رہا کیا گیا۔ ضمانتوں کی توثیق کا انحصار ٹرائل کورٹ پر تھا تاکہ مقدمے کی سماعت پوری ہو سکے۔ بعد ازاں ان الزامات کے تحت درخواستیں دائر کی گئیں کہ ایک ایسی فرم نے گندم بھاری منافع پر درآمد کی ہے جس کے مالکان وزیراعظم کے خاندان کے ارکان ہیں اور حکمران پارٹی کے بعض لوگ بینکوں سے بھاری قرضے ری شیڈول اور دیگر رعایتیں حاصل

کرنے کے لئے بینک افسران پر غیر معمولی دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ایئر مارشل (ر) اصغر خان عدالت کے علم میں یہ حقائق لائے کہ ایک ایجنسی نے انتخابی مقاصد کے لئے سیاستدانوں میں رقوم تقسیم کیں۔ اس فہرست میں جن لوگوں کے نام شامل تھے' ان میں وزیراعظم کا نام بھی تھا۔ یہ مقدمے زیرالتوا ہیں جو سپریم کورٹ میں چل رہے ہیں۔

وزیراعظم نے انسداد دہشت گردی ایکٹ نافذ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا جس کی عدلیہ نے اس بنا پر مخالفت کی کہ اس طرح سے عدلیہ کا ایک متوازی نظام قائم ہو جائے گا۔ بالخصوص ایسے حالات میں جبکہ ایسی عدالتوں کے ججوں کا تقرر بھی حکومت نے خود ہی کرنا ہے۔ یہ خصوصی قانون سپریم کورٹ کے فورم کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ اس قانون کو وکلا اقلیتوں اور پریس نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ سپریم کورٹ میں چند آسامیاں تھیں۔ میں نے چیف جسٹس آف پاکستان کی حیثیت سے وفاقی حکومت کو ہائی کورٹ کے 5 ججوں کا درجہ بلند کرنے کے لئے لکھا جن میں سے تین جج لاہور ہائی کورٹ میں سے' ایک سندھ ہائی کورٹ اور ایک پشاور ہائی کورٹ سے تھے۔ وفاقی حکومت لاہور ہائی کورٹ کے تین ججوں کی تقرری بوجوہ نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ تحریری طور پر لکھ کر دینے کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ معمول کے مطابق بھی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس جن کی ریٹائرمنٹ ابھی دور تھی' سپریم کورٹ میں نہیں جانا چاہتے تھے' لیکن ایک جج جن کی ریٹائرمنٹ قریب تھی' جانا چاہتے تھے۔ ہائی کورٹ کا جج 62 سال کی عمر میں ریٹائر ہوتا ہے جبکہ سپریم کورٹ کا جج 65 سال کی عمر میں ریٹائر ہوتا ہے۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے وزیر اعلیٰ اور صوبائی حکومت سے تعلقات اور ہم آہنگی رکھنے اور سمجھوتہ کرنے والا ہو' میں سپورٹ نہیں کر سکتا تھا۔

اس سے پہلے میں نے حکومت کو سپریم کورٹ کے ججوں کی تقرریوں کے سلسلے میں اتنا مزاحم کبھی نہیں پایا تھا' حتی کہ حکومت نے سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد سترہ سے کم کر کے تیرہ کر دی' جن میں چیف جسٹس بھی شامل تھے۔ اس پس منظر میں' میں سعودی عرب چلا گیا جہاں پاکستانی تارکین نے ایک سیمینار کا اہتمام کیا ہوا تھا' اس میں شرکت کی' عمرہ ادا کیا۔ مجھے تین چار دن باہر رہنا تھا' مسٹر جسٹس اجمل میاں نے قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان کا حلف اٹھایا اور پریس کو بتایا کہ چیف جسٹس اور دوسرے ججوں نے 5 ججوں کی تقرریوں کے بارے میں مجھ سے کوئی رابطہ یا مشورہ نہیں کیا اور یہ کہ سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد کا فیصلہ فل کورٹ کرے گا۔ مسٹر جسٹس ارشاد حسن خان نے ان کی حمایت کی۔ اخبارات میں یہ خبر بھی آئی کہ مسٹر جسٹس ارشاد حسن خان لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس شیخ ریاض احمد کے رشتہ دار ہیں' جو سپریم کورٹ میں نہیں آنا چاہتے تھے۔ وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ وہ چیف جسٹس شیخ ریاض احمد کے بغیر حکومت نہیں چلا سکتے۔ ججوں کے اجلاس کی تاریخ 13 اکتوبر 1997ء مقرر کر دی گئی۔ ایسی صورت میں اس اجلاس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ جب چیف جسٹس صرف چار روز کے لئے کہیں باہر گیا ہوا ہو۔ آئین کے آرٹیکل 177 میں واضح ہے کہ سپریم کورٹ کے تمام ججوں کا تقرر صدر چیف جسٹس آف

پاکستان کے مشورے سے کریں گے۔ اسی طرح ججوں کی تعداد کے بارے میں بھی آئین یہی کہتا ہے۔ میں فوراً واپس پہنچا اور اجلاس منسوخ کر دیا۔ درخواست پر فل کورٹ اجلاس بلایا گیا اور میں نے تیرہ ججوں کی تعداد سے اتفاق نہیں کیا۔ اکثریت کو حکومت سے اتفاق تھا اور وہ سپریم کورٹ میں زیادہ ججوں کی تعداد کے حق میں نہ تھے۔ بعد ازاں چھ ججوں نے صدر کو ایک خط لکھا جس میں انہوں نے چیف جسٹس آف پاکستان پر تنقید کی۔ اس کی کاپی وزیر قانون مسٹر خالد انور کو دی گئی جنہوں نے چیف جسٹس کو بدنام کرنے کے لئے چار سدہ اور ڈیرہ بگٹی کے سیاستدانوں کو اس کی مزید کاپیاں فراہم کیں۔

اسی دوران وفاقی حکومت نے صدر پر چیف جسٹس کے مواخذے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ادھر قومی اسمبلی اور سینٹ کا اجلاس جاری تھا اور دوسری طرف وزیراعظم کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدموں کی کارروائی ہو رہی تھی۔ حکومت کی طرف سے اسمبلی میں آئینی ترمیم کا بل پیش کیا گیا جس کے تحت سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی ریٹائرمنٹ کی عمر کو 65 سے کم کر کے 60 سال کرنا مقصود تھا۔ چیف جسٹس کے انتظامی اختیارات اور مقدمات کی اسائنمنٹ کے لئے تین سینئر ججوں کا بورڈ تشکیل دینے کی تجویز بھی دی گئی۔ ان حالات میں چیف جسٹس کی طرف سے آرٹیکل 190 کے تحت صدر کو سپریم کورٹ کے 5 ججوں کے تقرر کے لئے خط لکھا گیا' جو بہر حال ہو گئیں۔

جب یہ تقرریاں ہو گئیں اور ججوں نے حلف اٹھا لیا تو وزیراعظم کا ایک نمائندہ میرے پاس آیا اور ان کا پیغام دیا کہ اب جبکہ 5 ججوں کی تقرری کا مطالبہ

منظور کر لیا گیا ہے' اس کے جواب میں میں انہیں کیا دوں گا۔ میں نے کہا میں انہیں کچھ نہیں دے سکتا کیونکہ میرا مطالبہ ججوں کی آئینی تقرری کا تھا۔ یہ کوئی لین دین کا معاملہ نہیں تھا میں نے سیدھا سا سوال کیا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں مجھے تجویز دی گئی کہ میں وزیر اعظم کے خلاف مقدمات کی سماعت نہ کروں۔ میں نے ان سے معذرت کر لی کیونکہ قانون اور انصاف کے تقاضوں کے تحت شہریوں میں کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا اور محض اس لئے ان کے خلاف مقدمات کی سماعت روکی نہیں جا سکتی کیونکہ وہ وزیر اعظم ہیں۔ اس بات پر مجھ سے چھٹکارا پانے کی سازش شروع ہو گئی۔

اسی اثنا میں سپریم کورٹ میں آئین میں چودھویں ترمیم کو اس بنا پر چیلنج کر دیا گیا کہ اس ترمیم کی موجودگی میں ارکان پارلیمنٹ ایوان میں کھل کر اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکتے۔ ارکان پارلیمنٹ کو عبوری طور پر یہ رعایت دی گئی کہ وہ آزادی اظہار کا اپنا بنیادی حق استعمال کریں اور یہ کہ اس بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جائے گی اور یہ کہ وہ پارٹی فیصلے کے خلاف ووٹ کا حق استعمال کر سکیں گے۔ اس کے بعد وزیر اعظم کی قیادت میں چیف جسٹس کے خلاف باقاعدہ مہم کا آغاز کر دیا گیا۔ عوامی اجتماعات میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کردار کشی کی مہم شروع ہو گئی۔ ٹی وی پر کارٹون دکھائے گئے جن میں یہ تاثر دیا گیا کہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس نے لوٹا ازم کا راستہ دوبارہ کھول دیا ہے۔ ان حالات میں وزیر اعظم' وزیر قانون اور ایسے ارکان پارلیمنٹ کو نوٹس دیئے گئے جنہوں نے اپنی تقریروں میں چیف جسٹس کے خلاف ہتک آمیز ریمارکس دیئے تھے۔ وزیر اعظم کی طرف سے الزامات کا جواب دینے کے لئے ایس ایم

ظفر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ قومی اسمبلی کے سیکرٹری نے تقرریوں کا ریکارڈ پیش کیا مگر حذف شدہ ریمارکس کو ریکارڈ میں شامل نہیں کیا۔ کمرۂ عدالت میں ٹیلی ویژن لگا دیا گیا تاکہ چیف جسٹس کے خلاف کارٹون اور وزیراعظم اور دوسرے ارکان کی ہتک آمیز تقریریں سنائی جا سکیں۔

اسی دوران اس وقت کے صدر فاروق احمد لغاری کی صدارت میں چند اجلاس ہوئے جو قانون کی بالادستی کے لئے اپنا کردار ادا کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اجلاس میں چیف آف دی آرمی سٹاف بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں بڑی سیدھی اور کھری کھری باتیں ہوئیں اور مجھے یقین ہے کہ اس گفتگو کا ریکارڈ بھی موجود ہو گا' جواب سنا جا سکتا ہے چیف آف دی آرمی سٹاف اس موقف پر قائم رہے کہ آئینی معاملات کو آئینی طریقے سے باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے طے کیا جانا چاہئے۔ صدر بھی اس ضرورت پر زور دیتے رہے کہ اختلافات کو آئین اور قانون کے مطابق حل کیا جانا چاہئے۔ ایک اجلاس میں یہ تجویز دی گئی کہ توہین عدالت کے مقدمے کی سماعت کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دی جائے تاکہ اس دوران معاملات کو باہمی افہام و تفہیم سے سلجھایا جا سکے۔ میں نے اجلاس کے شرکاء کو بتایا کہ اگر یہ درخواست کمرہ عدالت میں کی جائے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو گا' تاہم اگلی تاریخ میں کمرہ عدالت کا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ قومی اسمبلی کے سیکرٹری قومی اسمبلی کی حذف شدہ ریمارکس سمیت ساری کارروائی اٹھا لائے اور انہوں نے عدالت میں پیش کر دی جس کے بعد دو ہفتے کے التوا کی درخواست کی گئی مگر دوسرے ججوں کے مشورے کے بعد ایک ہفتے کے لئے کارروائی ملتوی کر دی گئی اور یہ امید ظاہر کی

گئی کہ اس دوران معاملات کو باہمی افہام و تفہیم سے سلجھالیا جائے گا۔

چیف جسٹس کو اس بنا پر ہٹادیا گیا کہ وہ سنیئر جج نہیں اور انہیں آؤٹ آف ٹرن تعینات کیا گیا تھا۔ اگرچہ آئین میں ایسی کوئی پابندی نہیں تھی اور میں چیف جسٹس کی حیثیت سے ساڑھے تین سال گزار چکا تھا اور دونوں جج مسٹر ارشاد حسن خان اور خلیل الرحمان میرے مشورے سے مقرر ہوئے تھے اور میں نے ہی ان سے حلف لیا تھا۔ مسٹر جسٹس ناصر اسلم زاہد اس روز کراچی سے بروقت عدالت میں نہیں پہنچ سکے تھے مگر وہ میری معطّلی کے نوٹیفیکیشن پر دستخط کرنے کے لئے بے چین تھے مجھے رجسٹرار نے بتایا کہ مسٹر جسٹس اجمل میاں ایک ہفتے کی چھٹی پر اسلام آباد چلے گئے ہیں جہاں وہ حالیہ کشیدہ فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ اس دوران مسٹر جسٹس سعید الزمان نے چیف جسٹس کے اختیارات استعمال کرنا شروع کر دیئے اور انہوں نے اس حیثیت میں صدر، وزیراعظم، آرمی چیف، فضائیہ اور نیوی کے سربراہوں کو خطوط لکھے تھے۔

28 نومبر 1997ء کو سپریم کورٹ میں توہین عدالت کیس کی سماعت ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ لاہور سے بھری ہوئی بسیں لائی جارہی ہیں اور ان کے کارکن عدالت میں گڑبڑ کریں گے۔ رجسٹرار نے پولیس اور قانون نافذ کرنے والی دوسری ایجنسیوں کو آگاہ کر دیا جنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ حفاظتی اقدامات کر لیں گے۔ اب یہ سب جانتے ہیں کہ سپریم کورٹ پر کس طرح حملہ کیا گیا اور اس حملے کے ذمہ دار کون لوگ تھے۔ بی بی سی نے فلم بھی دکھائی ہے جس میں چند وزراء اور حکومتی پارٹی کے ارکان حملہ آوروں کی قیادت کر

رہے تھے۔اس حملے کا منظر سپریم کورٹ کے احاطے میں نصب کیمروں نے بھی محفوظ کیا۔بعد ازاں حملہ آوروں کو لنچ کے لئے پنجاب ہاؤس لے جایا گیا۔اگلے روز میں نے صدر کو ایک تفصیلی خط لکھا اور آئین کے آرٹیکل 190 کے تحت ان سے ججوں کے تحفظ کے لئے اقدامات کی درخواست کی۔اس خط کی ایک کاپی چیف آف آرمی سٹاف کو بھجوائی جنہوں نے اسے ڈیفنس سیکرٹری کو بھجوادیا جس نے بعد ازاں اس پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔

جو جج جسٹس سعید الزمان صدیقی کے حکم پر اسلام آباد آئے تھے' انہیں حکومت کی جانب سے پورا پروٹوکول دیا گیا اور مرسڈیز کاریں فراہم کی گئیں۔ یہ چیف جسٹس کے جاری شدہ روسٹر کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ مصالحت کی ایک آخری کوشش سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر عابد حسن منٹو اور بعض دوسرے ارکان نے کی' وہ میرے چیمبر میں آئے کہ میں تمام ججوں' بار ایسوسی ایشن کے صدر اور ارکان کا ایک اجلاس بلاؤں۔ میں نے اتفاق کیا اور سب کو چائے پر بلایا۔ سب نے اس امر پر اتفاق کیا کہ چیف جسٹس کو روسٹر بنانے اور ججوں کو مقدموں کی اسائنمنٹس دینے کا اختیار حاصل ہے' چنانچہ جو جج میری خواہش کے بغیر اسلام آباد آئے تھے میں نے ان کا روسٹر تبدیل کر کے انہیں اسلام آباد تک محدود کر دیا۔ میں نے دوسرے ججوں کی اس بات سے بھی اتفاق کیا کہ چیف جسٹس کی حیثیت سے میری تقرری کی سماعت فل بنچ کرے۔ میں نے چیمبر میں جا کر سات ججوں کا بنچ نامزد کر دیا۔اگلے روز میں نے خیر سگالی کے طور پر وزیراعظم کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں رکھا' مگر مجھے یہ جان کر سخت صدمہ ہوا کہ جسٹس سعید الزمان نے اپنا روسٹر جاری کر دیا ہے اور

پندرہ ججوں پر مشتمل فل بنچ تشکیل دے دیا ہے جس میں چیف جسٹس اور جسٹس اجمل میاں کو شامل نہیں کیا گیا۔ یہ مصالحت کی صریحاً خلاف وزی تھی۔ میں نے مسٹر عابد حسن منٹو کو بلوایا' انہیں بھی اس پر حیرت اور صدمہ ہوا۔ مسٹر منٹو نے وزیراعظم سے بات کی اور انہیں بتایا کہ ان حالات میں یہ اقدام مصالحانہ روش کے خلاف ہے اور سپریم کورٹ کے ججوں کو تقسیم کرنے کی ایک چال ہے بہر حال ان میں بعض جج ایسے تھے جو کھلم کھلا وزیراعظم کی حمایت کر رہے تھے۔ مفاہمت کے ختم ہونے کے بعد اگلے روز سپریم کورٹ کے دو الگ الگ روسٹر تھے۔

وزیراعظم کے حمایتی ججوں میں سے کسی ایک نے بھی سپریم کورٹ پر حملے پر افسوس کا اظہار نہیں کیا۔ سترہ میں سے دس ججوں کا بنچ جسٹس سعید الزمان کے روسٹر کے مطابق اور پانچ ججوں کا بنچ میرے روسٹر کے مطابق بیٹھ گیا۔ تین ججوں کے ایک الگ بنچ نے 13 ویں ترمیم پر پٹیشن کی سماعت کی' جس کے تحت عبوری امداد کو معطل کرنے کی کارروائی کی گئی تھی۔ دس ججوں کے بنچ نے' جو کسی اختیار کے بغیر تشکیل دیا گیا تھا بحیثیت چیف جسٹس میری تعیناتی کے خلاف سماعت کی اور میری تعیناتی کا نوٹیفیکیشن معطل کر دیا۔ بنچ نے حکومت کو ہدایت کی' وہ جسٹس اجمل میاں کو قائم مقام چیف جسٹس مقرر کر دے۔ قائم مقام چیف جسٹس کی تقرری کے موقع پر ایڈیٹوریم میں بہت بڑی تقریب کا انعقاد کیا گیا۔

اسی اثنا میں صدر فاروق احمد خان لغاری مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے استعفیٰ کیوں دیا' مجھے معلوم نہیں اور نہ انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ اس

سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی لڑائی آپ لڑ رہے تھے' جیسے میں اپنی لڑائی خود لڑ رہا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی رابطہ ہی نہیں تھا' پھر سازش کا سوال کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی سازش ہوئی تو اس سے اچھا اور کون سا موقع ہو سکتا تھا' جب ججز کیس کے فیصلے کے بعد اس وقت کی وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اور صدر فاروق لغاری نے سپریم کورٹ میں ایک ہی موضوع پر الگ الگ ریفرنس دائر کی۔ بعد میں (2) 58 بی کے تحت محترمہ بے نظیر کی حکومت برطرف کر دی گئی اور محترمہ نے پرائیویٹ رسپانڈنٹ کے طور پر اپنے ریفرنس کی سماعت کی درخواست کی' جو منظور کر لی گئی۔ نگران حکومت کے نئے اٹارنی جنرل نے موقف اختیار کیا کہ ججوں کی تعیناتی کے سلسلے میں صدر وزیر اعظم ایڈوائس (مشورے) کے پابند نہیں۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جب نواز شریف اپوزیشن لیڈر تھے تو انہوں نے خود کہا تھا کہ سپریم کورٹ کا جو بھی فیصلہ ہو' وہ اس کے پابند ہوں گے۔

چند لوگ اس سلسلے میں بہت سرگرم تھے۔ انہیں کراچی' پشاور اور کوئٹہ میں ججوں سے ان کی رہائش گاہوں اور سرکاری مقامات پر ملاقاتیں کرتے دیکھا گیا مجھے جس بات سے تکلیف پہنچی یہ تھی کہ میری تقرری کے نوٹیفیکیشن کو غیر آئینی طور پر ختم کیا گیا اور یہ کارروائی اس بنیاد پر کی گئی کہ میری تقرری آؤٹ آف ٹرن تھی۔ مسٹر جسٹس اجمل میاں کی تقرری کو اس بنیاد پر چیلنج کیا گیا کہ وہ 1997ء میں 65 سال کے ہو چکے تھے۔ آگرہ میں جس سکول میں انہوں نے میٹرک کیا' اس کے سرٹیفکیٹ کے مطابق ان کی پیدائش کا سال 1932ء ہے۔ سپریم کورٹ نے یہ رٹ درخواست صرف ان ریمارکس کے

ساتھ خارج کر دی کہ اس طرح ایک پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ بعد ازان جسٹس اجمل میاں نے اپنی تاریخ پیدائش میں 1932ء کے بجائے 1934ء کی تبدیل کی درخواست دی جو سندھ یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ نے منظور کر لی۔ کیا سنڈیکیٹ کسی کی عمر تبدیل کرنے کا مجاز ہے اور اجمل میاں کے میٹرک سرٹیفکیٹ پر آپشنل مضامین وہ نہیں جو 1949ء میں انہیں سندھ یونیورسٹی کی طرف سے جاری کئے جانے والے سرٹیفکیٹ میں درج ہیں۔ یہ ایسے شخص کی طرف سے کھلی دھاندلی کی مثال ہے جو عدلیہ کا سربراہ ہے۔ حال ہی میں صدارت سے الگ ہو جائیں گے تب اس مقدمے کی سماعت شروع کی جائے لیکن اپیلٹ کورٹ نے قرار دیا کہ قانون کی نظر میں سب شہری برابر ہیں' لہذا صدر کے خلاف مقدمے کی کارروائی شروع کی جائے' مگر یہاں جب تک کوئی شخص اقتدار میں ہے' اس کے خلاف آئین اور قانون کی خلاف ورزی پر کوئی کارروائی نہ کرنے کی روایت ڈال دی گئی ہے' حالانکہ آئین اور قانون میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ قانون کی بالادستی کا تقاضا ہے کہ اس روایت کو توڑا جائے اور اہل اقتدار کو اپنے خلاف الزامات کے جواب کے لئے عدالت میں آنے کا پابند کیا جائے۔"

جسٹس محمد بخش میمن

زندگی میں میری پسند و ناپسند کا معیار ہمیشہ اصولوں اور حق گوئی کی بنیاد پر رہا ہے۔ اس ضمن میں، میں جسٹس محمد بخش میمن کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ انہوں نے تمیز الدین خان کیس میں بڑا اچھا فیصلہ لکھا تھا۔ بڑے بولڈ جج تھے اس لئے مجھے بہت پسند تھے۔ میں ان سے اکثر رہنمائی حاصل کیا کرتا۔ وہ اکثر نصیحت کیا کرتے کہ فیصلہ تحریر کرنے سے قبل کیس کو بار بار پڑھنا چاہئے۔ اس طرح آپ کے سامنے کئی نئے پہلو آئیں گے۔ خود پہ اتنا اعتماد نہیں کرنا چاہئے کہ میں عقل کل کا مالک ہوں۔ کوئی بھی شخص Perfect نہیں ہوتا۔ انسان ہر وقت سیکھنے کے عمل میں رہتا ہے، چاہے وہ کسی بھی منصب پر ہو اور کسی بھی حیثیت میں ہو۔ یہاں تک کہ انسان اپنی کی گئی غلطیوں سے بھی سبق سیکھتا ہے۔ سیکھنے کا عمل ساری زندگی جاری رہتا ہے۔ بڑے تو بڑے انسان بچے سے بھی سیکھ سکتا ہے۔ بسا اوقات بچہ بھی ایسی بات کر جاتا ہے کہ وہ بات آپ کے ذہن میں نہیں ہو گی۔ علم کی کوئی انتہا نہیں، یہ تو سمندر کی مانند ہے۔ انسان کی عمر ختم ہو جائے گی لیکن علم ختم نہیں ہو گا۔ علم کی تلاش میں رہنے والے لوگ در حقیقت سچائی کی تلاش میں رہتے ہیں اور سچائی مل جانے پر انسان نصب العین کی طرف پیش

قدمی کرتا ہے۔ اپنے کیریئر کے دوران مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میں نے جسٹس محمد بخش میمن سے بہت سی اچھی باتیں سیکھیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علم کے بارے میں بے شمار اقوال ہیں جن میں علم کی فضیلت اور عظمت کے کئی حوالے آگہی اور معرفت کے انداز میں ہمیں ملتے ہیں مثلاً چھپاؤ تین چیزوں کو، شجاعت، علم، دولت کو کہ لوگ ان کے ہیں دشمن۔

موت کے بعد بھی ہڈیاں اس کی جس وقت گل سڑ چکیں، صاحب علم پاینده وزنده ہے۔

اور جاہل اگرچہ زمین پر نظر آتا ہے چلتا پھرتا مگر در حقیقت ہے مردہ
اسے سانس لیتا ہوا مردہ سمجھو
بدل نہ علم کا ڈھونڈ اس کے زور پر ہو کھڑا
(حصول علم کر، اس سے ہمیشہ زندہ رہ)
ہیں لوگ مردہ فقط اہل علم ہیں زندہ

مکالمہ

سوال :-نواز شریف نے 1997ء میں الیکشن میں کامیابی کے بعد آپ کو ہیرو کیوں کہا؟

جواب :-میں نے بے نظیر بھٹو کے خلاف جو سٹینڈ لیا' اس بنا پر میاں نواز شریف نے مجھے ہیرو کا خطاب دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں میرٹ پر تقرر نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے مخالفت کی جس کی انہیں تکلیف ہوئی۔ ظاہر ہے' سچ کہیں گے تو جواب میں نقصان کے لئے تیار رہیں سو میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ رد عمل کے طور پر انہوں نے جو کچھ کیا' سب پر عیاں ہے۔ لیکن میں آخر تک ڈٹا رہا۔ جج صاحبان نے جو فیصلہ دیا اس پر بھی میاں نواز شریف خوش ہوئے۔ بے نظیر بھٹو کی حکومت چلی گئی' وہ کیس بھی ہمارے پاس تھا۔ اس فیصلے سے بھی یہ خوش ہوئے کہ بے نظیر بھٹو کے جانے سے الیکشن ہوئے اور یہ برسر اقتدار آئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جب یہ لوگ اپوزیشن میں ہوتے ہیں تو انہیں عدلیہ اچھی لگتی ہے۔ جب وہی لوگ حکمران بن جاتے ہیں تو ان کے تیور بدل جاتے ہیں۔ پھر وہ عدلیہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عدلیہ نے آزادانہ طریقے سے کام کیا تو ہمارے خلاف ہو جائے گی۔ آخری

دنوں میں یہی ہوا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہمارے خلاف جو کیسز چل رہے ہیں' انہیں ختم کیا جائے۔ حکمرانوں نے مجھے کہا کہ آپ چھٹی پر یا پھر بیرون ملک چلے جائیں۔ اگر آپ چھٹی پر یا بیرون ملک نہیں جانا چاہتے تو میرے خلاف کیسز Adjourn کر دیں۔ جب تک آپ ریٹائر نہیں ہو جاتے۔ یہ بل لا رہے تھے کہ وزیر اعظم کے خلاف کوئی بھی کیس ہو تو اسے فل کورٹ سنے۔ ایسا کیوں کر رہے تھے۔ وزیر اعظم بھی عام انسان کی طرح ہوتا ہے۔ قانون میں اتنی تفریق نہیں ہونی چاہئے۔ آپ ایک طرف تو امیر المومنین بننا چاہتے ہیں۔ آپ نے حوالے دیئے کہ ہماری اسلامی روایات ہیں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ بھی قاضی کی عدالت میں پیش ہوئے تھے۔

اس ضمن میں اسلام نے تو خود ایسی ایسی زریں مثالیں پیش کی ہیں کہ ان میں ہمارے لئے نجات اور سبق آموزی کے جہان بند ہیں۔ یہ روایات اسلامی تہذیب اور تاریخ کا ایسا روشن باب ہیں جو ہر زمانے میں ہماری رہبری کے لئے موجود ہیں۔ یہی روایات ہمیں عدل کے استحکام اور تسلسل کو برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اگر آپ ان روایات کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے علیحدہ قانون کیوں ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ حمص کے گورنر حضرت عبداللہ بن قرط کے خلاف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لئے بالاخانہ بنوالیا تھا جس کی اجازت نہیں تھی۔ بالاخانے کو حضرت عمرؓ نے آگ لگوادی اور گورنر کو ایک جبہ پہنوا کر' ہاتھ میں ایک ڈول دیا اور کہا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو اس سے دماغ سے تفاخر کی بو نکل جائے

گی۔ یہ تھے اس دور کے گورنر۔ اس کے باوجود' سربراہ مملکت ان کی رفتار' گفتار' کردار پر کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ شکایتوں کی تحقیق و تفتیش سرعام (پبلک کے سامنے) ہوتی تھی۔ الزام ثابت ہونے پر' سزا بھی پبلک میں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک مرتبہ اس طریق کار کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ اس سے عمال حکومت بددل ہو جائینگے اور رعایا کی ان کے خلاف جراتیں بڑھ جائیں گی۔

اس پر آپ نے فرمایا تھا کہ جو عامل انصاف کا تقاضا پورا کرنے پر بددل ہوتا ہے وہ منصب حکومت کے قابل ہی نہیں۔ باقی رہا سزا کا پبلک میں دیئے جانا تو یہ قرآن کریم کے ارشاد کے عین مطابق ہے۔ لیکن دوسروں کا محاسبہ اور مواخذہ کرنے سے پہلے امیر المومنین خود اپنا محاسبہ کرتے اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے مواخذہ کے لئے پیش کرتے۔ تو میں میاں نواز شریف کا ذکر کر رہا تھا۔ جب یہ میری عدالت میں آئے تو انہوں نے کہا کہ میں چیف جسٹس کی عدالت میں چلا گیا۔ اتنا کافی ہے۔ اب انہیں معاملہ ختم کر دینا چاہئے اور خاموش ہو جانا چاہئے۔ میرا جواب تھا کہ معاملہ توہین عدالت کا ہے۔ قانون یہ کہتا ہے کہ اس میں غیر مشروط معافی مانگی جائے۔ نواز شریف نے عدالت میں آکر یہ کہا کہ ہمیں آپ مزید وقت دیں ہم تحریری درخواست فائل کریں گے۔ ہم دیکھ کر جواب دیں گے کہ ہمارے خلاف کیا الزامات ہیں۔ یہ معافی تو نہ ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ 28 نومبر 1997ء کا دن ہمارے لئے تاریک سیاہ اور تکلیف دہ ہے اور پوری قوم کے لئے یہ ایک شرمناک دن ہے۔ یہ حملہ حکومت کے رہنماؤں نے کرایا۔ اس میں وہ ملوث تھے اور یہ ان ہی کے مفاد میں تھا۔ سپریم

کورٹ کی بڑی تضحیک ہوئی اور اس ادارے کو جو عدل وانصاف کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا' برباد کرنے کی کوشش کی گئی۔ مجھے جب یہ دن یاد آتا ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے۔ دکھ اس لئے ہوتا ہے کہ کسی مہذب ملک میں حکومت اپنے ادارے پر حملہ نہیں کراتی۔ اس کا سب سے عجیب پہلو یہ ہے کہ یہ حملہ عوام نے نہیں کیا تھا کہ اسے عدلیہ پر عدم اعتماد تھا یا اسے انصاف نہیں مل رہا تھا۔ یہ حملہ حکومت نے کرایا تھا' کیونکہ وزیراعظم نواز شریف کے خلاف کچھ مقدمات تھے جن میں ان کے خلاف کرپشن کے الزامات بھی تھے۔ ایک توہین عدالت کا بھی مقدمہ تھا جس کی ہم سماعت کر رہے تھے۔ اس حملے سے سپریم کورٹ کی' عدلیہ کی بے عزتی ہوئی اور میں سمجھتا ہوں کہ نہ صرف عدلیہ کی بے عزتی ہوئی یا بربادی کا سامان تھا بلکہ ہمارے ملک میں جو نظام ہے اس کے تباہ ہونے کی بھی ایک نشانی بنا۔ نظام اب بھی ٹوٹتا نظر آرہا ہے۔ سسٹم فیل ہوتا نظر آرہا ہے کیونکہ دوسرے ادارے اپنی حدود کے اندر کام کر نہیں پا رہے' اس کا فیصلہ عدالتیں کرتی ہیں' لیکن اگر عدلیہ کے ادارے کو تباہ کیا جائے تو اس سے سارا نظام تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فرد واحد کی بات نہیں تھی' یہ ایک ادارے کی بات تھی ایک نظام کی بات تھی۔ اس سے ہمارے ملک کی بے عزتی ہوئی ہے۔ حالانکہ یہ اس بات کو دبانے کی جتنی بھی کوشش کریں کہ اس میں حکومت شامل نہیں تھی' وزرا شامل نہیں تھے لیکن ہمیں اچھی طرح یاد ہے۔ سپریم کورٹ میں کیمرے فکس ہیں۔ ہم نے اس سے بننے والی فلم دیکھی ہے اور بی بی سی نے بھی جو فلم بنائی تھی' بار بار دکھائی۔ اس میں صاف ظاہر تھا کہ حکومت کے وزرا اس حملے میں شامل تھے اور قیادت کر رہے تھے..... ان تصویروں میں

سید مشاہد حسین اور سیف الرحمٰن صاف دکھائی دے رہے تھے۔ پولیس والے کھڑے تھے اور جب سپریم کورٹ کے اہلکاروں نے ان سے کہا کہ آپ دیکھ رہے ہیں' حملہ ہو رہا ہے تو وہ ہنس رہے تھے اور روک تھام کے لئے کوئی اقدام نہیں کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس میں حکومت والے شامل ہیں' وزرا شامل ہیں' ہم انہیں کیسے روکیں۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ یہ حملہ حکومت والوں نے کرایا ہے۔ میں نے صدر مملکت کو جو خط لکھا تھا۔ صدر نے وہ خط چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل جہانگیر کرامت کو بھجوایا تھا۔ لیکن اس پر کچھ نہیں ہوا اور ہمیں تحفظ نہیں ملا۔

اس کے بعد توہین عدالت کا ایک کیس چل رہا تھا' آپ نے دیکھا کہ اس میں کیا ہوا؟ توہین عدالت کا جو ایک مقدمہ تھا اس میں کہا کہ سپریم کورٹ کا ایک فیصلہ ہے کہ حالات کا احاطہ کرتے ہوئے فیصلہ کیا جائے کہ توہین ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ وہ کیس تھا جس میں وزیراعظم وزرا اور دوسرے پارلیمنٹرینز ملوث تھے۔ دوسرا جو توہین عدالت کا کیس ہے یعنی سپریم کورٹ پر حملے کا تو اس پر جب صدر مملکت نے کہا تھا کہ مجھے بلایا جائے گواہ کی حیثیت سے' تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہم آپ کو گواہ کی حیثیت سے نہیں بلائیں گے۔ کیونکہ آپ عینی گواہ نہیں ہیں۔ اس میں عینی گواہ کی تو کوئی بات نہیں۔ جب آپ پہلے یہ کہہ چکے ہیں کہ واقعات کا احاطہ کر کے فیصلہ ہو گا تو صدر صاحب بھی اس بارے میں شہادت دینا چاہتے تھے۔ یہ توہین کیوں ہوئی۔ کیسز چل رہے تھے اور مجھے منع کیا جا رہا تھا کہ بھئی ہمارے خلاف مقدمات نہ چلائیں۔ یہ بات ظاہر تھی' میں نے چونکہ ان کی بات نہیں مانی میں کہتا تھا کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں'

اس لئے یہ مقدمات معمول کے مطابق چلنے چاہئیں۔ اس بات سے وہ ناراض تھے اور مجھے سماعت سے روکنے کے لئے حملہ کرایا گیا تھا۔ اس کے بعد آپ کو پتہ ہی ہے۔ پھر ہم پر مقدمات وغیرہ ہوئے اور ہمارے کچھ جج صاحبان بھی ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ پھر پٹیشن میں میرے نوٹیفیکیشن آف اپائنٹمنٹ کو معطل کیا گیا اور اس کے بعد دو روسٹر بننے کی کوششیں ہوئیں۔ بار کے ارکان اور سپریم کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر اور دیگر ارکان نے کوششیں کیں کہ کوئی افہام و تفہیم سے بات ہو جائے۔ ان ججوں نے تسلیم کیا کہ میں چیف جسٹس ہوں اور مجھے روسٹر کے اجرا کی اتھارٹی ہے اور میں نے وہ روسٹر جاری بھی کیا۔ ان کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ آپ کے تقرر کے بارے میں جو کیس ہے اس کی سماعت ہونی چاہئے۔ میں نے سات ججوں کا بنچ بنا دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سے مکر گئے۔ کیونکہ کہا جاتا ہے کہ وزیراعظم نواز شریف اس پر ناراض ہوئے تھے کہ جو معاہدہ ہوا ہے اس میں وزیراعظم کے خلاف جو مقدمات ہیں وہ چیف جسٹس کے پاس ہیں اس لئے یہ معاہدہ کس قسم کا ہوا' کیونکہ اس سے حکومت کو تو فائدہ نہیں ہوا۔ چنانچہ پھر یہ جج صاحبان اس معاہدے سے پھر گئے اور دوسرے دن دو روسٹر نکلے۔ دو بنچیں تھیں۔ حالانکہ میرا تقرر آئین کے مطابق تھا اس ضمن میں جسٹس منظور قادر اور جسٹس طفیل عبدالرحمٰن کی مثال موجود ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اب بھی آئین میں اس کی گنجائش موجود ہے اور اس میں ترمیم نہیں کی گئی۔ حکومت مجھے ہٹانا چاہتی تھی اور مجھے ہٹانے کے لئے انہوں نے ساری تدبیریں اور ترکیبیں عمل میں لانے کی کوشش کی۔ ان دنوں ایک طرف عدالت میں کیس چل رہے تھے اور دوسری طرف اخباروں میں آتا تھا۔

آئین میں ترمیم کے لئے اتنے بل تیار ہیں جن میں ججوں کی مدت عہدہ کم کر رہے ہیں۔ چیف جسٹس کے اختیارات کم کر رہے ہیں وغیرہ۔ اس طرح وہ چیف جسٹس کو ڈراتے دھمکاتے تھے کہ آپ ان مقدمات کی سماعت نہ کریں تو ساری بات ہو جائے۔ لیکن ہم نے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ اس طرح دس جج اس طرف مل گئے اور ان دس میں سے آٹھ وہ جج تھے جو میری سفارش سے سپریم کورٹ کے جج بنے۔ یہ لوگ میرے خلاف اس لئے ہو گئے کیونکہ انہیں حکومت کی حمایت حاصل تھی۔

یہ ساری باتیں اخباروں میں آئی تھیں۔ مجھے ذاتی علم نہیں ہے کہ پیسے لئے تھے' بک گئے لیکن جو عمل ہے جو رزلٹ ہے اس سے تو بالکل ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے جان بوجھ کر حکومت کو سپورٹ کیا۔ خود سابق صدر فاروق لغاری کے سامنے وزیراعظم نواز شریف نے کہا اور یہ بات ریکارڈ پر ہے ''میں ججوں پر کام کر رہا ہوں'' انہوں نے اس وقت کے صدر کو یہ بھی کہا کہ سجاد علی شاہ تنہا ہو جائیں گے۔ ان کے ساتھ جج ہیں یا نہیں' کیونکہ ہم دوسرے ججوں پر کام کر رہے ہیں۔ اب کام کس طرح ہوتا ہے' وہ آپ بھی جانتے ہیں۔

پیسے لئے یا نہیں' میں اس کی بات نہیں کرتا لیکن دیگر فوائد تو حکومت سے لے سکتے ہیں۔ کس کا بیٹا باہر سکالر شپ پر گیا کون سی سروس ملی۔ کس کو کیا ملا۔ یہ سارے فوائد ہیں اور یہ حکومت سے لئے ہیں۔ بیرون ملک ایک سال کے لئے سکالر شپ پر جانا' اس کے عوض کیا کچھ دینا نہیں پڑتا ہے؟ حملے سے پہلے ہمیں تھوڑی بہت اطلاع ملی تھی کہ یہ لوگوں کو لاہور سے بسوں میں لا رہے ہیں۔ رجسٹرار نے آئی جی پولیس کو' حکومت کو' جو بھی متعلقہ ایجنسیاں

تھیں، سب کو اطلاع کر دی تھی۔ انہوں نے یقین دلایا تھا کہ اگر لوگ آئے تو انہیں سپریم کورٹ تک نہیں پہنچنے دیا جائے گا۔ اس پر ہم مطمئن ہو گئے۔ لیکن یہ لوگ تو لائے گئے تھے۔ ہم کورٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایس ایم ظفر صاحب دلائل دے رہے تھے کہ ان سے پی ٹی وی کے چیئرمین پرویز رشید نے کان میں کچھ کہا۔ ہم نے پوچھا کیا بات ہے؟ ایس ایم ظفر نے کہا کہ یہ باہر جانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ اپنے وکیل سے کہلوائیں۔ اس پر پرویز رشید کے وکیل کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ باہر جانا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ جائیں۔ کیونکہ ہمیں اس وقت تو پتہ نہیں تھا کہ یہ سازش کا ایک حصہ ہے۔ اس طرح یہ باہر گئے۔ ہم نے شور سنا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ زور سے کھلا اور لوگ بھاگتے ہوئے اندر آئے ان میں ایک نوجوان بھی تھا۔ وہ ڈائس کے قریب پہنچ گیا۔ مزید دو افراد بھی تھے۔ وہ زور زور سے بول رہے تھے۔ اس لڑکے نے کہا کہ جج صاحبان آپ اندر چلے جائیں، ہجوم آرہا ہے۔ اس لڑکے کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ کسی ترکی اخبار کا پاکستان میں نمائندہ تھا۔ وہ ترکی زبان بھی جانتا تھا۔ لڑکے نے باآواز بلند کہا کہ آپ پر حملہ ہونے والا ہے۔ وہ چیف جسٹس کو گرفتار کرنے آرہے ہیں۔ اس دوران کورٹ کے اندر بہت سے لوگ داخل ہوئے وکلاء حضرات کھڑے ہو گئے۔ میں نے جج صاحبان سے مشورہ کیا کہ اب ہمیں چاہئے کہ سماعت ملتوی کر دیں۔ لہذا ہم سماعت ملتوی کر کے اپنے اپنے چیمبرز میں چلے گئے۔ ہجوم تھا کہ بڑھتا جا رہا تھا۔ پولیس اہلکار ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ حملہ آوروں میں حکمران مسلم لیگ کے عہدے دار بھی شامل تھے۔ ایک ہنگامہ تھا جو ہر طرف منہ اٹھائے طوفان پیدا کر رہا تھا۔ یہ کسی فرد واحد کی گستاخی نہیں تھی،

اس میں پورا گروپ شامل تھا۔

اس ساری صورتحال کے بارے میں میں نے خط لکھا مگر اس پر عمل نہ ہوا۔ جبکہ آئین کے آرٹیکل 190 میں ہے کہ ایسے مواقع پر تمام ایگزیکٹو ایڈمنسٹریٹو ایجنسیوں کو سپریم کورٹ کی مدد کرنی چاہئے۔ میں نے دوسرا خط لکھا۔ میرا دوسرا خط سیکرٹری دفاع کو بھیج دیا گیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ صدر نے میرے خط کی کاپی چیف آف آرمی سٹاف اور وزیراعظم کو بھیجی تھی اور خود بھی خط لکھا تھا کہ آپ کی حکومت اس طرح سے کر رہی ہے جو غلط ہے۔ یہ حکومت کی ناکامی ہے' عدلیہ ایک ادارہ ہے' اس پر حملہ کرانا اچھی بات نہیں ہے۔ آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی حکومت ناکام ہو گئی ہے۔

سوال :- کہا جاتا ہے کہ آپ' صدر مملکت اور آرمی چیف تینوں مل کر وزیراعظم نواز شریف کی حکومت الٹنا چاہتے تھے ؟

جواب :- نئی نئی حکومت آئی تھی۔ کون الٹنا چاہے گا۔ چیف جسٹس کا تو کسی سازش میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ کیوں شامل ہو گا۔ چیف جسٹس کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس کے لئے تو سارے وزیراعظم ایک جیسے ہیں۔ ہم تو صرف یہ چاہتے تھے کہ ہمیں آزاد رہنے دیں۔ اگر قانون کی حکمرانی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ کتنی افراتفری ہے۔ اس ملک کا آگے چل کر کیا حال ہو گا۔ اقتصادی حالت دیکھیں۔

سوال :- ملک کے مستقبل کے بارے میں آپ کیا کہیں گے ؟

جواب :- میں تو کہتا ہوں' تاریک اور تشویشناک ہے اقتصادی صورتحال گھمبیر

ہے۔اگر قرضے ملے ہیں تو وہ ہم نے واپس بھی کرنے ہیں۔ مہنگائی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جتنے مسائل ہیں ان میں اقتصادی صورتحال بڑی سنگین ہے۔

سوال :-15ویں ترمیم کرنے میں نقصان کیا ہے ؟

جواب :-اس کی ضرورت ہی نہیں۔ اس میں بدنیتی کا عنصر ہے۔ ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ آپ کو اس ترمیم کی ضرورت نہیں۔ آئین کے اندر کافی اسلام ہے۔ 15ویں ترمیم کے بغیر بھی قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون پاس نہیں ہو سکتا۔ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ ان کو حکم جاری کرنے کا اختیار مل جائے اور یہ امیر المومنین بن جائیں۔ اس وقت ملک بچانے کے لئے ملک بچاؤ' ایجنڈے پر اپوزیشن کا اتحاد ہونا چاہئے۔

سوال :- آپ نے فیصلہ کیا کہ توہین عدالت کیس کا فیصلہ سنا دیا جائے تو ایک اعلیٰ فوجی افسر آپ کے پاس گیا تھا اور استدعا کی کہ سماعت چند روز کے لئے ملتوی کر دیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے چند قریبی دوستوں نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ کیا یہ درست ہے۔ کیونکہ اس کے بعد آپ کو اور صدر مملکت کو رخصت ہونا پڑا؟

جواب :- یہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح سٹیلمنٹ کرا دیں۔ میں یہ کہتا تھا کہ اگر آپ سماعت ملتوی کرانا چاہتے ہیں تو عدالت میں درخواست کریں۔ ہم تمام جج مل کر فیصلہ کریں گے کہ آپ کی درخواست منظور کی جائے یا رد کی جائے۔ ان کی درخواست پر تمام جج صاحبان نے فیصلہ کیا کہ انہیں ایک ہفتے کی مہلت دی جائے۔ انہوں نے جو مہلت کی درخواست کی۔ یہ ایک دھوکا' فریب اور چال تھی۔ ان کو ہم نے جو وقت دیا وہ ہمارے خلاف استعمال ہوا۔

سوال :- سپریم کورٹ کے مشہور مقدمے کے بعد آپ نے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیوں کیا اور پھر یہ فیصلہ کیوں تبدیل کیا؟

جواب :- میں نے مستعفی ہونے کا کبھی فیصلہ نہیں کیا۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ میں استعفیٰ دینے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں نے تو کہا تھا کہ آپ نے جو کرنا ہے' کریں

سوال :- کونسی سیاسی جماعت آپ کے نظریات کے قریب ہے ؟

جواب :- ابھی تک میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ فی الحال میں نے اپنے نظریات پیش کرنے کے لئے بار ایسوسی ایشنز کا فورم منتخب کیا ہے۔ اگر قانون کی حکمرانی ہو۔ تو اچھی حکومت آسکتی ہے اور سسٹم کامیاب ہو سکتا ہے۔ رول آف لاء کی وجہ سے آئین کو بالادستی حاصل ہو گی۔ حکمرانوں کو اگر قانون کی پاسداری کا کہا جاتا ہے' تو وہ کہتے ہیں۔ ''ہم قانون سے بالاتر ہیں'' بہتری اسی صورت ممکن ہے اگر عدالتیں آزادانہ فیصلے کریں اور جوڈیشری پر حکومت کا رسوخ نہیں ہونا چاہئے۔ لوگ بے چین ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ نہ جانے ملک میں کیا ہونے والا ہے۔

سوال :- کونسا سیاست دان آپ کے خیال میں بہتر ہے ؟

جواب :- عمران خان بہت اچھا ہے۔ مجھے ان سے کافی امیدیں ہیں۔ ائر مارشل (ر) اصغر خان سے میری ملاقاتیں ہوئی ہیں بڑا صاف ستھرا انسان ہے۔ ان کے خیالات بہت اچھے ہیں۔ ہر سیاست دان اپنے طریقے سے سوچتا ہے۔ منزل سب کی ایک ہے' راستے الگ الگ ہیں۔ سب ملک کے لئے اچھا ہی سوچتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ سیاست میں جھوٹ نہ ہو۔ جھوٹ اور کرپشن کا

خاتمہ ہونا چاہئے۔ خواندگی کی شرح کو بڑھایا جائے۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں خوشحالی کیسے آئے گی۔ ہمیں اپنے ملکی وسائل کو مد نظر رکھ کر ترقی کا سوچنا چاہئے۔ زراعت کو بھی سائنسی طریقے سے آگے بڑھانا چاہئے۔ ہمارے ملک میں پلاننگ بڑی غلط ہوتی ہے۔ آپ کو شہر بنانا ہے تو سب سے پہلے آپ نقشہ بنائیں گے۔ اس کے بعد سڑکیں بنیں گی۔ بجلی پہنچے گی اور دیگر کام ہو گا۔ ہمارے یہاں پلاننگ اور پھر مختلف محکموں کے درمیان کوآرڈینشن نہیں۔ پیرس میں، میں نے خوبصورت سڑکیں دیکھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ان سڑکوں کو بنے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ انہوں نے بتایا دو سو برس ہو چکے ہیں۔ دو سو برس پہلے تو اس قسم کی بھاری ٹریفک نہ تھی۔ مگر انہوں نے دو سو برس پہلے ہی سوچ لیا کہ سائنس کی ترقی سے بھاری ٹریفک میں اضافہ ہو گا۔ اس چیز کو مد نظر رکھ کر انہوں نے سڑکیں بنائیں۔

ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں شرح خواندگی بہت کم ہے۔ اس کے علاوہ ہم بنیادی طور پر بد دیانت ہیں۔ ہر کام میں پیسہ بنانا چاہتے ہیں۔ کوئی اچھا کام نہیں ہوتا۔ رشوت لی جاتی ہے۔ اکثریت کی کوشش ہوتی ہے کہ دولت آسانی سے حاصل ہو جائے۔ ہمارے ملک نے ترقی نہیں کی البتہ بعض لوگوں نے مالی حوالے سے بہت ترقی کی ہے۔ ملک غریب ہے، لوگ امیر ہیں۔ ملک کی معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ ہم قرض پر اور غیر ملکی امداد پر چل رہے ہیں۔ نواز شریف اور بعض دیگر افراد کے پاس اتنا روپیہ ہے کہ یہ ملک خرید سکتے ہیں۔ حکمرانوں کی اپیل پر اب کوئی پیسے نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارن کرنسی اکاؤنٹس منجمد (Freeze) کر دیئے۔ لوگ رو رہے

ہیں۔بیر ون ممالک سے جن لوگوں نے اپنے ملک ڈالرز اور پاؤنڈ بھیجے' وہ سب رو رہے ہیں۔ حکومت کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ حکومت کو تو ایسے اقدامات کرنا چاہئے جس پر اس پر اعتماد بحال ہو۔ ان افراد میں بعض جج صاحبان بھی ہیں جنہوں نے اپنی ریٹائر منٹ کے بعد ملنے والی رقم فارن کرنسی میں جمع کرادی تھی' اس خیال کے تحت کہ ڈالر کی ویلیو میں اضافہ ہو گا۔ ان سب کو نقصان ہوا ہے۔

بیرون ممالک میں مقیم پاکستانی رو رہے ہیں یہ سب غلط ہوا ہے۔ ہمارے حکمران پلاننگ نہیں کرتے۔ حکومت کو شرح خواندگی بڑھانے پر زیادہ توجہ دی جانی چاہئے۔ بجٹ کا زیادہ حصہ تعلیم ہی پر صرف ہونا چاہئے۔ بنگلہ دیش میں کافی ترقی ہوئی ہے۔

انہوں نے برتھ کنٹرول کیا ہے۔ فارن ایکسچینج ان کے پاس بڑا اچھا ہے۔ میں بنگلہ دیش گیا تو راستوں میں بے شمار عورتوں کو جاتے دیکھا۔ میں نے پوچھا تو ان لوگوں نے بتایا کہ ہماری عورتوں کی اکثریت مختلف فیکٹریوں اور دفاتر میں کام کرتی ہیں۔ انہوں نے ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بڑی ترقی کی ہے جو ہمارے یہاں نہیں ہوئی۔ بنگلہ دیش میں' میں نے ایک جگہ دیکھا کہ دیوار کے ساتھ چند اخبار لگے تھے اور لوگ وہاں کھڑے ہو کر اخبار پڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ اخبار خرید کر کیوں نہیں پڑھتے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ اخبار خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اخبار سٹینڈ پر سرخیاں پڑھ کر گزارا کر لیتے ہیں۔ اس سے آپ اندازا لگائیں کہ وہاں شرح خواندگی ہم سے زیادہ ہے۔

سوال :- خبر چھپی تھی کہ آپ ملت پارٹی میں شمولیت اختیار کر رہے ہیں ؟

جواب :- ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سب سیاستدانوں سے ملتا ہوں مگر فی الحال کسی پارٹی میں شمولیت اختیار نہیں کی۔ فاروق احمد خان لغاری سے میرے اچھے مراسم ہیں۔ نوابزادہ نصر اللہ خان' ائر مارشل اصغر خان' قاضی حسین احمد سے بھی ملاقاتیں رہتی ہیں۔

جہاں تک ملت پارٹی کا تعلق ہے۔ ابھی اس کے قیام کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے کہ یہ پارٹی لاہور میں زیادہ پاپولر ہے لوگ بتاتے ہیں کہ یہ بڑے منظم طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ پارٹی کامیاب ہو جائے گی۔ ذاتی طور پر فاروق لغاری صاحب کی قدر کرتا ہوں۔ جب لغاری صاحب کسی جلسے یا فنکشن وغیرہ میں تقریر کرتے ہیں تو دلائل اور اعداد و شمار کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ انہوں نے حکومت میں رہتے ہوئے کافی کچھ سیکھ لیا ہے۔ جس موضوع پر بھی یہ گفتگو کرتے ہیں۔ اس پر انہیں کافی عبور ہوتا ہے۔ چار برس صدر مملکت رہے ہیں۔ قبل ازیں وفاقی وزیر بھی تھے۔ سلجھے ہوئے اور شریف آدمی ہیں۔ بہتر نالج کے مالک ہیں۔ میں انہیں پسند کرتا ہوں۔ بعض لوگ ان پر اعتراض بھی کرتے ہیں۔ مگر اعتراض تو ہر شخص پر کیا جاسکتا ہے۔

سوال :- کہا جاتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو نے شاہد حامد صاحب کو سپریم کورٹ کا جج بنانے کی سفارش کی تھی جو آپ نے مسترد کر دی تھی۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب :- آپ نے صحیح کہا ہے حکومت کی طرف سے کوشش ہو رہی تھی کہ شاہد حامد صاحب کو جج بنا دیا جائے۔ مگر فیصلہ ان کے حق میں نہ ہو سکا۔ میں آپ

کووجوہ نہیں بتاؤں گا۔ (قہقہہ)

سوال :- آپ نے جنوری 1999ء میں ایک بیان میں کہا تھا کہ حکومت ملک میں سعودی عرب کی طرز کا نظام لانا چاہتی ہے۔ جس کے تحت وہاں کی طرح جلدی جلدی مسجدوں میں فیصلے ہوں گے اور لوگوں کے اس طرح سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ اس کے بعد لوگ ڈر جائیں گے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ سعودی عرب میں جو نظام نافذ ہے وہ درست نہیں ؟

جواب :- میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سعودی عرب میں جو نظام نافذ ہے وہ درست نہیں۔ سعودی عرب میں بادشاہت ہے۔ وہاں فرمان الٰہی جاری ہوتا ہے۔ اگر کوئی نظام ایک ملک میں ہے' تو وہ اس ملک کے لئے اچھا ہو سکتا ہے۔

سوال :- 18 اپریل 1992ء کو صدر اسحاق خان نے اسمبلی توڑ دی۔ 25 اپریل کو بر طرف کئے گئے وزیر اعظم میاں نواز شریف نے سپریم کورٹ میں براہ راست رٹ داخل کر دی۔ اس کیس کا فیصلہ نواز شریف کے حق میں ہوا۔ آپ واحد جج تھے جنہوں نے اختلاف کیا۔ اس کی وجہ ؟

جواب :- میں اس بات کو غلط سمجھ رہا تھا۔ میں نے اپنے ساتھی جج صاحبان سے اتفاق نہیں کیا۔ مجھے حق پہنچتا تھا کہ جس بات کو صحیح سمجھوں' اس بارے میں اپنا فیصلہ دوں۔

سوال :- آپ نے ایک بیان میں کہا تھا کہ رفیق تارڑ' سیف الرحمٰن' شہباز شریف اور کیپٹن صفدر ججوں سے ان کے گھروں پر جا کر ملاقاتیں کرتے تھے۔ آپ ان جج صاحبان کے نام بتانا پسند کریں گے ؟

جواب :- یہ باتیں اخبارات میں چھپ چکی ہیں کہ کون کون' کس کس جج سے

ملا۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ کے جہاز کہاں کہاں جاتے تھے۔ لوگوں کو سب علم ہے کراچی کے قصر ناز میں کون کون آتا تھا۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں' جو بیان نہیں کی جاسکتی۔ کیا کچھ ہوا کیسے ہوا۔ سب کو علم ہوا۔ جب اخبارات میں سب کچھ شائع ہوا تو انہوں نے تردید کیوں نہ کی کہ ہم فلاں فلاں ججوں سے نہیں ملے تھے۔ جہاز میں جو سفر کرتا ہے۔ مسافروں کے نام درج ہوتے ہیں۔ کوئٹہ میں مغرب کے بعد جہاز لینڈ نہیں کرتا پھر ان کے جہاز مغرب کے بعد کوئٹہ میں کیوں اور کیسے لینڈ کرتے رہے آپ کیا سمجھتے ہیں کہ مجھے علم نہیں تھا کہ میرے جج صاحبان کیا کر رہے ہیں اور کن شخصیات سے ملاقاتیں کر رہے ہیں۔

سوال :- آپ نے ایک بیان میں مارشل لاء کی حمایت کی تھی۔ آپ جیسے جمہوری ذہن کے مالک سے اس قسم کے بیان کی امید نہ تھی۔ ایسا بیان آپ نے کیوں دیا؟

جواب :- میں مارشل لاء کے قطعاً حق میں نہیں ہوں۔ لیکن تمام اختیارات فرد واحد کو دے دینا یہ بھی جمہوریت نہیں۔ میرا یہ کہنا ہے کہ عبوری حکومت قائم ہونی چاہئے جو الیکشن کرائے۔ موجودہ گورنمنٹ جو الیکشن کرائے گی وہ منصفانہ نہیں ہوں گے۔

سوال :- احتساب ایکٹ کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے ؟

جواب :- قانون سب کے لئے یکساں ہونا چاہئے۔ حکومت نے احتساب ایکٹ بناتے وقت اس میں ترمیم کر کے 85ء سے 1990ء تک کا عرصہ باہر نکال دیا۔ بعد ازاں ان لوگوں کو بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا جنہوں نے قرضے لے کر معاف کرائے تھے یاری شیڈولنگ کروائی تھی جبکہ اپوزیشن کے ایسے

ریفرنسوں پر بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

میرے دور میں گندم سکینڈل' ری شیڈولنگ سکینڈل اور قرضے معاف کرانے کے سکینڈل پر اب کارروائی کیوں نہیں ہو رہی۔ احتساب کمیشن کے پاس وہ اختیارات ہی نہیں ہیں جو احتساب بیورو کے سربراہ کے پاس ہیں۔ بے نظیر بھٹو کے خلاف احتساب بنچ کے فیصلے میں بڑی جلدی کی گئی۔ سپریم کورٹ نے احتساب بنچ کو ہدایت کی تھی کہ انصاف صاف و شفاف ہونا چاہئے مگر اس پر عمل نہیں کیا گیا۔

دہشت گردی کیوں ہوتی ہے

دہشت گردی کیوں ہوتی ہے۔ مسجدیں اور امام بارگاہیں محفوظ نہیں سارا الزام عدالتوں پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اصل بات تفتیش (Investigation) کی ہے۔ مجھے آپ یہ بتائیں کہ کتنے Accused موقع پر پکڑے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص گواہی دے کہ فلاں شخص نے قتل کیا ہے کوئی ایسا جج نہیں ہو گا' جو اس کو سزا نہ دے۔ سب سے پہلی بات تفتیش کی ہے۔ تفتیش صحیح طریقے سے نہیں ہوتی۔ ہمارے ملک کی انٹلیجنس ایجنسیاں کیا کام کر رہی ہیں۔ ان کا کام دہشت گردوں کو پکڑنا ہے۔ یہ ان کا نیٹ ورک ہے کہ معلوم کریں' کہاں دہشت گردی ہو رہی ہے' کون دہشت گردی کرا رہا ہے' کس طرح ہوتی ہے اس کا سدباب کیا ہے۔ اگر حکومت اور ایجنسیاں دہشت گردوں کا پتہ نہیں لگا سکتیں تو پھر ایسی حکومت کو رہنے کا کوئی جواز نہیں۔ نواز شریف کی حکومت یہ تاثر دے رہی ہے کہ ان کی تمام تر ذمہ داری عدالتی نظام پر ہے۔ عدالتوں میں فیصلے تاخیر سے ہوتے ہیں اس لئے دہشت گردوں کو اپنی من مانی کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ یہ کبھی نہیں دیکھیں گے کہ پولیس تفتیش صحیح کر رہی ہے یا نہیں..... میں سیشن جج رہا ہوں مجھے پتہ ہے کہ پولیس کس

طرح تفتیش کرتی ہے۔ آپ کبھی پولیس سٹیشن جا کے دیکھیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ میں پولیس پر تنقید نہیں کر رہا۔ ان میں اچھے لوگ بھی ہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ سب سے زیادہ کرپشن پولیس کے محکمے میں ہے..... میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ہوتا کیا ہے ایک شخص گھر میں قتل ہو جاتا ہے۔ مقتول کا بیٹا یا کوئی قریبی عزیز پولیس سٹیشن چلا جاتا ہے۔ وہ جا کے بتاتا ہے کہ ہمارے گھر میں قتل ہو گیا ہے..... تھانیدار پوچھتا ہے کہ کس نے قتل کیا ہے؟ وہ شخص بتائے گا کہ فلاں آدمی نے کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہماری دشمنی ہے۔ پولیس اہلکار اس سے دریافت کرے گا کہ اس شخص کا والد ہے۔ بھائی کتنے ہیں تم سب کو نامزد کر دو کہ یہ حملہ کرنے آئے تھے اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ ان کی فیملی کے تمام افراد اندر ہوں گے تو پیروی کوئی نہ کر سکے گا۔ چنانچہ پولیس افسر ایف آئی آر کے مطابق تمام لوگوں کو حراست میں لے لیتا ہے۔ حراست میں لینے کے بعد پولیس اہلکار دونوں پارٹیوں سے پیسے لیتے ہیں..... حراست میں لینے والوں کو کہیں گے کہ آپ تھوڑے دنوں کے لئے قید ہیں۔ آپ فکر نہ کریں..... ضمانت ہو جائے گی۔ سیشن کورٹ میں آپ کی ضمانت نہ ہوئی تو ہائی کورٹ میں ہو جائے گی۔ کوئی نہ کوئی عدالت آپ کو شک کا فائدہ دے کر چھوڑ دے گی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے۔ ہمیں بھی پتہ ہوتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے ہزاروں کی تعداد میں قتل کے کیس سنے اور ان کا فیصلہ کیا ہے۔ اصل تفتیش پولیس کی ہوتی ہے وہی لاء اینڈ آرڈر چلاتی ہے۔ اگر صحیح مجرم ہو اس کے خلاف گواہی ہو تو وہ کیسے چھوٹ سکتا ہے کیا عدالتوں نے کسی کو سزا نہیں دی۔ اگر کسی ملک میں فوجی عدالتیں قائم ہو جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوا' مارشل لاء نافذ ہو گیا۔ فوجی

عدالتیں صرف مارشل لا دور میں چلتی ہیں ایک طرف آپ بھاری مینڈیٹ کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جمہوریت کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف فوجی عدالتیں قائم کر رہے ہیں۔ آئین اور جمہوریت کی موجودگی میں آپ دوسرا نظام نہیں لا سکتے وہی نظام رہ سکتا ہے جس میں ہائی اور سپریم کورٹس کا کنٹرول ہو۔ حکومت میں انسداد دہشت گردی کی جو عدالتیں بنائیں اس میں سارا جھگڑا ججوں کی تقرریوں پر ہوا ہے۔ یہ مسلم لیگ کے لوگ رکھنا چاہتے ہیں۔ پیپلز پارٹی والے اپنے ہم خیال ججز رکھنا چاہتے تھے۔ ان ججز کو آپ جیسا کہیں گے' ویسا ہی کریں گے آپ کسی ریٹائرڈ جج کو تین سال کے لئے رکھتے ہیں یا کسی ایڈووکیٹ کو لاتے ہیں تو وہ آپ کی مرضی کے مطابق فیصلے کرے گا۔

میں نے بھی ججز کے خلاف کچھ ریمارکس پاس کئے تھے۔ حاکم علی عباسی نے ایک شخص کو پھانسی کی سزا دے دی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ پھانسی کی سزا کیوں دے رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ سیاسی تقرر تھا۔ کہ ایسے لوگوں کو جج بنا دیا جاتا ہے جن کو قانون کا علم نہیں ہوتا۔ ججوں کا تقرر میرٹ پر ہونا چاہئے۔ نہ کہ حکومت ان کا تقرر کرے۔ ہر حکومت اپنی پسند کے جج رکھنا چاہتی ہے۔ وزیراعظم نواز شریف نے ٹی وی پر اپنے خطاب کے دوران اعلان کیا کہ فلاں فلاں افراد حکیم محمد سعید کے قتل میں ملوث ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ لوگ ملوث نہیں تھے انہیں غلط پکڑا گیا ہے۔ پولیس والے مار مار کے اگلوا لیتے ہیں۔ چاہے کسی نے جرم کیا ہی نہ ہو۔

یہ ہمارا سب سے بڑا ثبوت ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے ہمارے درمیان کسی قسم کی ملی بھگت (Conspiracey) نہیں تھی ہم صدر کے خلاف تھے

نہ بے نظیر بھٹو کے 'اگر صدر سے ملے ہوتے یہ ہمارے لئے بہترین موقع تھا کیونکہ وزیراعظم بے نظیر کی حکومت ختم ہو چکی تھی۔ بے نظیر بھٹو بے چاری کہہ رہی تھی کہ مجھے پرائیویٹ کیمسٹری میں آنے دیں۔ ہم نے اسے یہ موقع فراہم کیا۔ ہم نے کہا آپ آئیں ہم سنیں گے نگران حکومت کا موقف بھی یہی تھا کہ ججوں کی تعیناتی میں وزیراعظم کا مشورہ لازمی ہیں یہ بات ہمارے فائدے میں تھی لیکن ہم نے کہا۔

As long as we have coustitution which cou-
tains parliamentary form of government in
which prime minister is the head of the gover-
ment and advise of Prime minister under arti-
cale 45 is binding on all other matter. It is also
binding on all national matters.

یہ اتنا اچھا فیصلہ تھا کہ ساری قوم اس سے خوش ہوئی۔ سب لوگ کہتے تھے کہ عدلیہ آزاد ہے اگر عدلیہ آزاد نہ ہوتی تو وار (Hit) کرانے کا بہترین موقع تھا۔ نگران حکمران تو خود ہی کہہ رہے تھے کہ آپ Hold کریں کہ وزیراعظم کا مشورہ لازمی نہیں۔ ہم نے ایسا کیوں نہ کیا اگر ہم ایسا کہہ دیتے تو عدلیہ اور بھی آزاد ہو جاتی۔

دوسرا کیس اچکزئی کا تھا۔ انہوں نے آٹھویں ترمیم کو چیلنج کیا تھا۔ یہ ترمیم ضیاء الحق کے دور میں آئی تھی یہ وہ دور تھا جب انہوں نے 1985ء میں آئین کو Revive کیا تھا۔ اس کے ذریعے انہوں نے محمد خان جونیجو کی

حکومت میں قومی اسمبلی سے مارشل لاء کے تمام احکامات کو موثر (Vali-date) قرار دلایا تھا۔ انہیں یہ خوف تھا کہ کہیں عدلیہ مارشل لا کے ضابطوں کو غیر قانونی قرار نہ دے دے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مارشل لاء ختم کر دیا۔ غیر جماعتی بنیادوں پر منتخب ہونے والی قومی اسمبلی اور حکومت کے درمیان یہ معاہدہ ہوا تھا۔ آٹھویں ترمیم میں بہت سی شقیں شامل تھیں۔ اسلامی شقیں وفاقی شرعی عدالت عدلیہ کے اختیارات بھی کم کئے گئے۔ اسی ترمیم میں آرٹیکل 58-2-B تھا یہ آرٹیکل صدر کے فائدے میں تھا۔ ضیاء الحق کہتے تھے کہ ملک میں بار بار مارشل لاء لگتا ہے اہم مارشل نہیں لگانا چاہئے۔ وہ صدر اور وزیراعظم کے اختیارات میں توازن قائم کرنا چاہتے تھے۔ ان کے خیال میں صدر کو اتنا طاقتور ضرور ہونا چاہئے کہ وہ وزیراعظم پر کڑی نظر رکھ سکے۔ اگر وزیراعظم کوئی غلط کام کرتے یا آئین کی خلاف ورزی کرتے تو صدر اس صورتحال میں کچھ کر سکے۔ آرٹیکل 58-2- B کے تحت صدر کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق حکومت کو معزول کر سکے۔ 77ء کے بعد اس ملک میں مارشل لا نہیں لگا۔ آرٹیکل 58-2-B استعمال ہوا جتنی بار بھی ہوا۔ ضیاء الحق نے سب سے پہلے محمد خاں جونیجو کی حکومت ختم کی پھر غلام اسحاق خان نے بے نظیر حکومت کو معزول کیا' بعد ازاں یہی سلوک نواز شریف کی حکومت کے ساتھ کیا گیا۔ چوتھی بار اسی آرٹیکل کو بروئے کار لاتے ہوئے سردار فاروق احمد لغاری نے بے نظیر حکومت کو ختم کیا۔

نواز شریف دوبارہ اقتدار میں آئے تو ان کے پاس اسمبلی میں دو تہائی اکثریت تھی۔ انہوں نے چوٹی میں جا کر فاروق احمد لغاری سے بات چیت کی۔

ملتان میں چیف آف آرمی سٹاف سے اس مسئلے پر گفتگو کی۔ نواز شریف نے جلدی جلدی خواہ کسی کو معلوم ہوا یا نہ ہوا اس آرٹیکل 58-2-B کو ختم کرایا۔ صدر کو چیف آف آرمی کے تقرر کا جو اختیار حاصل تھا وہ وزیراعظم نے لے لیا۔ اب آئین کے مطابق پوزیشن عجیب سی ہو گئی ہے۔ اب وزیراعظم بہت زیادہ طاقتور (Extra power ful) ہو گئے ہیں۔ اب ان پر کسی کنٹرول نہیں there is no check on وہ اپنی مرضی سے یا اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک سے اقتدار سے الگ ہو سکتے ہیں جب دو تہائی اکثریت ہو تو عدم اعتماد کی تحریک پاس ہی نہیں ہو سکتی۔ اس قسم کی صورتحال میں میرا خیال تھا کہ عدلیہ کو سرگرم ہونا چاہئے جوڈیشل ایکٹوازم ہونا چاہئے عدلیہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ آئین کی بالادستی رکھنے کے لئے Rule of law قائم کرے۔ عدالت یہ کام آئین کی تشریح کر کے کر سکتی ہے اگر انتظامیہ یا مقنّنہ اپنی حد سے تجاوز کرے تو عدلیہ اسے خبردار کرے۔ قومی اسمبلی جو قانون پاس کرتی ہے۔ کیا وہ آئین کے یا بنیادی حقوق کے مخالف تو نہیں۔ یہ طے کرنا عدلیہ کے اختیار میں ہے۔ عدلیہ حکومت کو کہہ سکتی ہے کہ فلاں معاملے میں آپ نے حد سے تجاوز کیا ہے میں نے ہتھکڑی کیس میں وزیراعظم کو نوٹس دیا تھا کہ آپ کی بطور وزیراعظم بہت بڑی شان ہے آپ کابینہ کے اجلاس کی صدارت کریں۔ بڑے بڑے فیصلے کریں اگر بعض افسران نے کوئی غلط کام کیا ہے اور آپ کو علم ہوا ہے تو آپ ٹیلی فون کریں ان افسران کی مجاز اتھارٹی ان کے خلاف ایکشن لے سکتی ہے۔ اس اتھارٹی سے کہا جائے کہ ان افسران کے خلاف اینٹی کرپشن میں کیس درج کرایا جاتے ایف آئی آر کٹوائیں تاکہ ان لوگوں کو قانون کے تحت جو تحفظ

حاصل ہے اس کے بھاگ دوڑ کر سکیں اگر وزیراعظم کے حکم پر کسی افسر کو ہتھکڑی لگے اور اسے ٹی وی پر دکھایا جائے تو کون جج اس افسر کو ضمانت دے گا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے انہیں کہا یہ ظلم ہے۔ یہ معاملہ آپ کے اختیار میں نہیں آتا۔ اگر اس بات پر وزیراعظم ناراض ہو جائیں اور عدلیہ کے ساتھ محاذ آرائی شروع ہو جائے تو پھر قانون کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔ جب قانون کی حکمرانی نہیں ہوتی تو پھر وہی کچھ ہو گا جو ہو رہا ہے۔ لوگ آخر کیوں اتنے متنفر' بیزار اور بے چین ہیں نظام صحیح طرح کام نہیں کر رہا۔ اقتصادی بحران ملک میں موجود ہے اس صورتحال کے بارے میں اخبارات میں خبریں بھری پڑی ہیں۔ انڈیا کے ساتھ حکومت کے تعلقات ٹھیک نہیں ہو رہے۔ واجپائی نے عہد دیا ہے کہ اگر پاکستان نے کشمیری مجاہدین کی مدد بند نہ کی تو پاک بھارت بس سروس بند ہو جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات جنگ کی طرف جا رہے ہیں۔ لیکن نہیں چاہتے کہ جنگ ہو دوسری طرف نواز شریف نے بھی کہا ہے کہ ہمارے پاس جو ایٹمی صلاحیت ہے ہم نے کسی کے ساتھ اپنی اس صلاحیت کو استعمال نہ کرنے کا وعدہ نہیں کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم جنگ میں یہ استعمال کر سکتے ہیں..... اگر جنگ میں ایٹمی ہتھیار استعمال ہوئے تو دونوں ملک تباہ ہوں گے۔ اگر پاکستان بھارت کو مارے اور بھارت پاکستان کو مارے تو درمیان میں عوام ہی مریں گے۔ یہ کوئی عقل مندی کی بات نہیں۔ فائدے کے بجائے نقصان ہو گا..... یہ بھی صحیح ہے کہ کشمیر پر کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔..... نہ وہ مانتے ہیں اور نہ ہی یہ درمیان میں کسی بڑی طاقت کو ثالث بننے کی درخواست کرتے ہیں۔ جب تک تیسرا ملک ثالث نہیں بنتا کشمیر

کے مسئلے پر پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ بھارت کہتا ہے کشمیر اس کا اٹوٹ انگ ہے اس بارے میں پاکستان بات ہی نہ کرے..... اگر بھارت بات نہیں کرنا اور سننا چاہتا پھر تو بات ہی ختم ہو گئی۔ اگر بھارت تجارتی تعلقات کی بات کرتا ہے تو اس کا کیا جواز ہے۔ کشمیر کے بارے میں فیصلہ ہو سکتا ہے ایسا فیصلہ جس پر کشمیری سب راضی ہوں کشمیر بھارت کو ملتا ہے یا پاکستان کو یا خود مختار کوئی فیصلہ تو ہو تاکہ بات ایک طرف لگے۔ یہ اس وقت ہو گا جب کوئی تیسرا فریق ثالث بنے گا۔

آرٹیکل 258-2-B کے ختم ہونے سے ایک خلا پیدا ہو گیا ہے حکومت کی طرف سے اختیارات میں تجاوز کے خلاف چونکہ اب کوئی چیک (Remedy) نہیں اس لئے خدانخواستہ مارشل لا کی بات ہو سکتی ہے۔ مسلح افواج کو ملک کو انتشار سے بچانے کے لئے اقدام کرنا پڑے گا..... پچاس سال گزرنے کے باوجود ہم نے جمہوری طریقے سے ملک کو چلانا نہیں سیکھا ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ جمہوریت ہے کیا..... بھارت میں حالات جو بھی ہیں وہاں جمہوریت تو ہے۔ یہ بات تو ماننا پڑے گی۔

سوال :- پاکستان کو قائم ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں شاہ صاحب آپ کے خیال میں بہتر حکومت کونسی تھی؟

جواب :- جب پاکستان قائم ہو گیا تو اس کی حکومت کو چلانا تھا اس وقت حالات مختلف تھے حکومت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری تھی۔ اس کے علاوہ اثاثہ جات کا معاملہ بھی تھا۔ وہاں سے آنے والے اپنی جائیداد بھی ادھر چھوڑ آئے تھے اس وقت جو بھی حکومتیں بنیں انہوں نے اپنا

کام کیا۔ یہ باتیں ماضی کی ہیں What is past is right بشرطیکہ اس کا نتیجہ اچھا نکلے۔ 58 کا مارشل لاء لگنے تک جو بھی حالات تھے ٹھیک تھے 56 کا آئین موجود تھا۔ ایک نظام تھا دوسری خاص بات یہ تھی کہ پاکستان کے دو حصے تھے اور دونوں کے درمیان بھارت حائل تھا۔ یہ بڑی نازک صورتحال تھی۔ 56ء کے آئین میں ملک کے دونوں حصوں کے درمیان مساوات (Parity) قائم کی گئی لیکن مشرقی پاکستان میں عوام کی اکثریت ہونے کے باوجود انہوں نے اس اصول کو تسلیم نہ کیا۔ اس کے بعد مارشل لاء اور 71ء میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔ ان سب تبدیلیوں کو مدنظر رکھنا چاہئے مشرقی پاکستان علیحدہ ہونے کے بعد نئے مسائل پیدا ہوئے۔ اس وقت مغربی پاکستان کے بقا کا مسئلہ تھا۔ جس ملک کا آدھا حصہ علیحدہ ہو جائے وہاں اقتصادی بحران بھی آیا۔ ہمارے پاس محدود وسائل تھے جنگ کے بعد پاکستان کا کچھ علاقہ اور 90 ہزار فوجی بھارت کے پاس قید تھے۔ بھٹو صاحب نے ان تمام معاملات کو بھارت کے ساتھ حل کیا۔ پھر آئین کی تشکیل کا مرحلہ آیا۔ مغربی پاکستان کے صوبوں نے خود مختاری کا مطالبہ کیا یہ آئین چلا اور پھر 1977ء میں مارشل لاء لگ گیا ہمارے ملک کے ساتھ معاملہ کچھ عجیب سا ہے اس ملک میں جمہوریت کو پھلنے پھولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب جو جمہوریت آئی ہے حکمران دو تہائی اکثریت لے کر آئے ہیں ہم نے خود دیکھا کہ پندرہ یا بیس فیصد لوگ ووٹ ڈالنے آئے تھے۔ کہتے ہیں ہم کو بھاری مینڈیٹ ملا ہے۔ کیا بھاری مینڈیٹ لے کر اس طرح ملک چلایا جاتا ہے۔ دو منٹ میں بغیر کسی بحث و تمحیص کے آئین میں تبدیلی لائی جاتی ہے قواعد میں نرمی کی جاتی ہے۔ 13 ویں ترمیم آئی۔ پھر 14 ویں جس میں ارکان

اسمبلی کے منہ پر پٹی باندھ دی گئی۔ 15ویں ترمیم کے ذریعے تمام اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں دے دیئے گئے ہیں۔ کیا جمہوریت اور آمریت میں کوئی فرق نہیں۔ کیا ہم جمہوریت کی طرف جارہے ہیں یا آمریت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اگر جمہوریت غلط راستے پر چل پڑے تو اس کا علاج ہم مارشل لاء کے ذریعے کرتے ہیں۔ پھر مارشل لاء کے اثرات ختم کرنے میں دس سال لگ جاتے ہیں اور اس ملک کی خیر کرتے..... سویت یونین بہت طاقتور ملک تھا اس کے پاس ایٹمی طاقت بھی تھی لیکن اقتصادی بنیاد کمزور تھی۔ ہم تو اللہ سے خیر مانگتے ہیں اللہ ان سب لوگوں کو عقل دے۔ یہ اپنے ملک کے حالات کے بارے میں غور و فکر کریں۔ آپس میں اتحاد کریں۔ جو ملک رہ گیا ہے اس کو بچائیں۔

سوال :- بے نظیر بھٹو نے اپنے ایک بیان میں کہا کہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ میں نے ایک جونیئر جج کو چیف جسٹس بنادیا۔ آپ اس بیان کے بارے میں کیا کہنا چاہیں گے ؟

جواب :- یہ ان کی ذاتی سوچ ہے کہ انہیں اب غلطی کا احساس ہوا ہے' جب میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ میں خود چل کر ان کے پاس نہیں گیا تھا کہ مجھے چیف جسٹس بنادو۔ ہو سکتا ہے' ان کو مجھ سے غلط توقعات وابستہ ہوں جو میں پوری نہ کر سکا ہو۔ مثلاً وہ نااہل لوگوں کو بطور جج تعینات پر بضد رہیں۔ آؤٹ آف ٹرن ترقیاں اور نامزدگیاں ہمارے ملک میں کوئی حیران کن بات نہیں۔ پاکستان میں کتنے چیف آف آرمی سٹاف ہیں' جن کو آؤٹ آف ٹرن آگے لایا گیا۔ پھر ایک شخص کے بارے میں بات کیوں کی جاتی ہے۔

میں قانون کی بالادستی پر یقین رکھتا ہوں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو نے

عدلیہ کے بارے میں ہمیشہ غلط رائے قائم کی۔ انہیں ہمیشہ ان کے ساتھیوں نے غلط اطلاعات بہم پہنچائیں۔ میں کسی کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتا مگر وہ ہمیشہ ایسے لوگوں میں گھری رہی ہیں، جن کا ظاہر اور باطن ایک نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انہیں آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتے جن سے وہ گزر رہی ہیں۔

سپریم کورٹ پر حملہ
کیس کا فیصلہ

سپریم کورٹ حملہ کیس میں مسلم لیگی وزرا شامل تھے اور یہ کہنا کہ انہیں پہچانا نہیں گیا درست بات نہیں عوام اس فیصلے پر خوش نہیں ادارے اپنی حفاظت خود کیا کرتے ہیں لہذا عدلیہ کو بھی اپنی حفاظت خود کرنا ہو گی۔ عدلیہ میں بھی کالی بھیڑیں موجوہ ہیں جن کا احتساب کیا جانا ضروری ہے۔ کئی ججوں نے اپنی عمریں کم لکھوائیں ہیں اس لئے تمام ججوں کے میٹرک کے سرٹیفکیٹ چیک کئے جائیں اور ان کے تمام اثاثوں کی چھان بین کی جائے۔ جمہوریت کے دور میں سندھ میں گورنر راج بھاری مینڈیٹ کی توہین ہے لہذا حکومت کو چاہئے کہ وہ یا تو اسمبلی معطل کر کے نئے انتخابات کرائے یا پھر بھاری مینڈیٹ کے گن گانا چھوڑ دے سپریم کورٹ پر حملے کا جب واقعہ ہوا میں کورٹ میں موجود تھا اور اس کی فلم موجود ہے جس میں تمام وزرا موجود تھے جنہیں نوٹس تک جاری نہیں کئے گئے۔ جبکہ یہ فلم بی بی سی اور سی این این سے بھی ٹیلی کاسٹ کی گئی تھی اور سابق صدر فاروق لغاری نے بھی سپریم کورٹ میں درخواست

دی تھی کہ وہ اپنا بیان ریکارڈ کرانا چاہتے ہیں اور بتانا چاہتے ہیں کہ اس واقعے کا اصل محرک کون ہے لیکن سپریم کورٹ نے اجازت نہیں دی اور یہ کہنا کہ واقعے میں ملوث افراد کو پہچانا نہیں گیا درست نہیں اس فیصلے پر عوام خوش نہیں ہیں ادارے اپنی حفاظت خود کیا کرتے ہیں اس لئے عدلیہ کو بھی اپنی حفاظت خود کرنا ہو گی لیکن اس وقت عالم یہ ہے کہ عدلیہ کو حکومت کی اور حکومت کو عدلیہ کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے شیعہ سنی کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے دونوں طرف کے لوگوں کو بلایا تھا اور دونوں گروہ تصفیے کے لئے تیار بھی تھے لیکن اس کی سماعت نہ ہو سکی اور حکومت اب خود اس مسئلے کو دبا رہی ہے۔ اگر عدلیہ اس مسئلے کو سنجیدگی کے ساتھ لے تو ملک سے مذہبی خون کرابے کا خاتمہ ہو سکتا ہے اس کی سماعت کے لئے سپریم کورٹ کے تین جج مقرر کئے جائیں۔ ہم نے ایٹمی دھماکہ مجبوری میں کیا تھا اور مجبوری کے کام پر جشن منانا درست نہیں۔ یہاں ہر حکومت چاہتی ہے کہ وہ ایٹمی دھماکے کا کریڈٹ خود لے جائے جبکہ اس پروگرام کا آغاز بھٹو نے کیا تھا۔ عدلیہ کا بھی احتساب ہونا چاہئے کیونکہ کئی ججوں نے اپنی عمریں کم لکھوائیں ہوئیں ہیں تمام ججوں کے میٹرک سرٹیفکیٹ چیک کئے جائیں اور ان کے تمام اثاثوں کی چھان بین کی جائے۔

سید سجاد علی شاہ کا نواز شریف سے پہلا اختلاف

سید سجاد علی شاہ کے نواز شریف کے ساتھ اختلافات کا آغاز 1993ء میں ہوا۔ اُس وقت چیف جسٹس نسیم حسن شاہ کی سربراہی میں فل بنچ نے صدارتی اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔ تب تمام جج ایک طرف اور محترم سید سجاد علی شاہ دوسری طرف تھے جس کی جھلک ان کے درج ذیل نوٹ میں بخوبی نظر آتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"سماعت کے دوران مدعی علیہ کی طرف سے یہ بنیادی اعتراض اٹھایا گیا کہ آئین کے تحت درخواست جو کہ براہ راست سپریم کورٹ میں دائر کی گئی ہے درست نہیں اور قابل سماعت نہیں (آئین کے آرٹیکل نمبر (3) 184 کے تحت) دونوں یعنی مسٹر عزیز۔ اے ملک' فاضل اٹارنی جنرل پاکستان برائے صدر بطور مدعی علیہ نمبر 1 اور مسٹر ایس ایم ظفر فاضل وکیل برائے کیئر ٹیکر (نگران) وزیر اعظم بطور مدعی علیہ نمبر 3 نے انتہائی زور سے درخواست کی مخالفت کی اس بنا پر کہ حکم انفساخ نے ایسوسی ایشن کی آزادی سے متعلقہ آئین کے آرٹیکل نمبر 17 میں درج شدہ بنیادی حق کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ان کے مطابق آرٹیکل نمبر 17 سیاسی پارٹی بنانے اور اس کا ممبر بننے کا حق فراہم کرتا ہے۔ مگر یہ بنیادی حق نہیں دیتا کہ حکومت کو جاری رکھا جائے جو کہ آئین کے دیگر احکامات کے تحت چلائی جاتی ہے۔ اس ضمن میں سائل کی طرف سے اٹھائے گئے دعوی کا انکار کیا جاتا ہے اور سخت متنازعہ ہے آئین کا آرٹیکل نمبر 199 ہائی کورٹ کی سماعت کا اختیار دیتا ہے اور آرٹیکل نمبر (3) 184 سپریم کورٹ کو (ہائی کورٹ کو زیر آرٹیکل 199 کے تحت اختیار سماعت کی طرح) اختیار سماعت دیتی ہے۔ مگر اس صورت میں کہ جب سپریم کورٹ یہ سمجھے کہ

اس میں سرکاری مفاد کا سوال (بحوالہ تکمیل بنیادی حقوق زیر چیپٹر ا حصہ دوئم) ملوث ہو۔ سائل کی طرف سے یہ عرض کیا گیا کہ اس کی سیاسی پارٹی کو بنیادی حق حاصل ہے کہ وہ اپنی حکومت کو اپنی معیاد پوری ہونے تک جاری رکھے۔

آئین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کئی دوسرے احکامات ہیں جن کے تحت حکومت کو جاری رکھا جاتا ہے۔ آرٹیکل A- (2) 91 کہتا ہے کہ صدر قومی اسمبلی کے ممبر کو وزیراعظم بننے کے لئے مدعو کریگا (وہ ممبر جس پر ممبران کی اکثریت کا اعتماد ہو اور ایسا آدمی آرٹیکل کی کلاز نمبر 3 کے تحت حلف اٹھائے گا۔ آرٹیکل 91 کی کلاز نمبر 5 حکم دیتی ہے کہ وزیراعظم جس کو اکثریت اعتماد حاصل نہیں اس کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اسمبلی سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرے آئین کے آرٹیکل (A) 58 کے تحت ضروری ہے کہ صدر مملکت قومی اسمبلی کو ختم کر دیگا بشرطیکہ وزیراعظم ایسی ہدایت دے۔ آرٹیکل کی کلاز نمبر (2) صدر مملکت کو اپنی مرضی سے قومی اسمبلی ختم کرنے کا اختیار فراہم کرتی ہے۔ اگر آئین کے مذکورہ بالا احکام کو ملا کر (اجتماعی طور پر) پڑھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آرٹیکل نمبر 17 سیاسی پارٹی بنانے یا اس کا ممبر بننے کا حق دیتا ہے ماسوائے خاص قانونی بندش کے لیکن سیاسی پارٹی کو کوئی مزید بنیادی حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی حکومت کو جاری رکھ سکے۔ تاوقتیکہ اس کی معیاد پوری ہو جائے۔ مس بے نظیر بھٹو بنام فیڈریشن آف پاکستان وغیرہ کے کیس میں (پی ایل ڈی 416SC1989) پولیٹیکل پارٹی ایکٹ 1962ء میں ترامیم کو چیلنج کیا گیا کہ وہ آئین کے آرٹیکل (2) 17 کے مطابق نہیں ہیں۔ جس میں پاکستان الیکشن کمشن میں سیاسی پارٹی کی عدم رجسٹریشن کی صورت میں

سزا ہے کہ اس کو سیاست میں حصہ لینے سے ہٹا دیا جائے جہاں تک سیاسی پارٹی کے تصور کا تعلق ہے۔اس ضمن میں مندرجہ ذیل رپورٹ کے صفحہ نمبر 520 پر یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔

"اس لئے جہاں سیاسی پارٹی بنانے کے حق کے آرٹیکل 17 کے تحت آرٹیکل نمبر (2) کے تحت حق دیا گیا ہے' وہاں آرٹیکل 16 کے تحت ممبران کو اجلاس کرنے کا حق دیا گیا ہے اور زیرِ آرٹیکل 15 جگہ جگہ جانے کا حق فراہم کیا گیا ہے اور تقریر کی آزادی اور اظہار خیالات کا حق آرٹیکل 19 کے تحت دیا گیا ہے۔ علیٰ ھذا القیاس۔ یہ اس لئے ہے کیونکہ اس طرح کے بنیادی حقوق شہریوں کو دیئے گئے ہیں اور ایسوسی ایشن مختلف آرٹیکلز کے تحت دیئے گئے بنیادی حقوق کے متعلق کلیم کر سکتی ہے صرف اس بنیاد پر کہ ان کی پارٹی شہریوں کی اکثریت سے بھری ہوئی ہے۔ تاہم ایک سیاسی جماعت کر اس کے ممبران کوئی اونچی بنیادیں نہیں حاصل کرتے (با متعلق دیگر بنیادی حقوق جو کہ بطور فرد وہ کلیم نہ کر سکتے تھے) علاوہ ازیں سیاسی جماعت مختلف آرٹیکلز کے تحت دی گئی آزادی کو اختیار کرتے ہوئے مقرر شدہ مناسب حدود' بندشوں میں رہتے ہوئے کام کریگی"

علاوہ ازیں اس کیس میں یہ طے پایا گیا کہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ 1962 کی دفعات (1) 3' 3-A' 3-B' 3-C اور 6 کے احکامات بنیادی حق کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے اس حد تک باطل قرار دیئے گئے۔

10- مس بے نظیر بھٹو وغیرہ فیڈریشن آف پاکستان وغیرہ (PLD 1989 (SC66) کے کیس میں آئین کے آرٹیکل (2) 17 کی روشنی میں

ریپریزنٹیشن آف پیپل ایکٹ 1976ء کی دفعہ 21 کو جانچنے کے بعد یہ طے پایا کہ مذکورہ ایکٹ کی دفعہ 21 آئین کے آرٹیکل (2)17 میں دیئے گئے بنیادی حق کے خلاف ہے کیونکہ دوران کاروائی انتخابات یہ دفعہ سیاسی پارٹیوں کی شمولیت اور ان کی موجودگی/حیثیت کو نہیں مانتی خصوصاً انتخابات کے نشانات کے اجرا کے معاملے میں اور لہذا اس وجہ سے اس حد تک باطل ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی سب نشستوں کے انتخابات میں ہر سیاسی جماعت حصہ لینے کی اہل ہے۔

انتخابات کے لئے منتخب شدہ نشانات لینے کے لئے سیاسی جماعتیں اس امر کی اہل ہوں گی کہ وہ رول نمبر 9 کے تحت رول نمبر 2 کے احکامات سے فائدہ اٹھائیں۔

11- پذیرائی کے سوال سے متعلق سماعت کے دوران میری رائے درخواست کی پذیرائی کے حق میں بہت زیادہ تھی۔ جو کہ دو ظاہراً قائل کرنے والی وجوہات کی بنا پر تھی۔ اولاً عدالتی مستعدی کے نئے رجحان سے متاثر ہوتے ہوئے میری رائے تھی کہ آئین کے آرٹیکل نمبر (3) 184 کا وسیع دائرہ میں ترجمہ کروں۔ تاکہ سرکاری اسناد سے متعلقہ مقدمات کے بارے میں اختیار سماعت تلاش اور بیان کروں۔ اس معاملہ کو متوازی پن' مشابہت کا فائدہ دینے کے بعد (جیسا کہ اوپر بیان ہوا) میں نے دو مثالی کیس مد نظر رکھے جن میں سپریم کورٹ نے براہ راست آئینی درخواستیں وصول کیں۔ آرٹیکل (3) 184 اور 17 کے بغور اور گہرا مطالعہ کے بعد (بمعہ دیگر احکامات آئین اور دو فیصلہ شدہ کیس جن کا بعد میں ذکر آئے گا اور بے شمار دیگر اتھارٹیوں جو کہ اس ضمن میں

ہیں)اس رائے/ نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ موجودہ کیس میں آئین کے آرٹیکل (3) 184 کے تحت ایک درخواست جو کہ سپریم کورٹ میں براہ راست دائر کی گئی ہے' قابل پذیرائی نہیں ہے اور اس مقصد کے لئے ہائی کورٹ کی طرف رجوع کیا جانا چاہیئے تھا۔

12- بیگم نصرت بھٹو بنام چیف آف آرمی سٹاف وغیرہ(PLD 1977 SC657) کے کیس میں آئینی پٹیشن براہ راست سپریم کورٹ میں دائر کی گئی (بغیر ہائی کورٹ جائے) سب سے پہلا جو اعتراض لگایا گیا وہ یہ تھا کہ درخواست چیف آف آرمی سٹاف کے خلاف ہے جبکہ حراست / نظر بندی کے احکامات چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے دیئے۔ اس اعتراض کو فوری طور پر اس بنا پر نبٹا دیا گیا کہ چیف آف آرمی سٹاف چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بھی ہے اور یہ کہ یہ اعتراض اپنی نوعیت میں فنی ہے اور اس کو اس طریقے سے دور کیا جا سکتا تھا کہ مدعا علیھم میں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کا اضافہ کیا جائے۔

دوسرا اعتراض جو لیا گیا وہ یہ تھا کہ سائل بیگم نصرت بھٹو آئین کے آرٹیکل (3) 184 آرٹیکل 199 کے تحت وہ مظلوم/ رنجیدہ نہ ہے کیونکہ اس نے اپنے بنیادی حق کے خلاف الزام نہیں لگایا بلکہ دوسروں (زیر حراست) لوگوں کے متعلق لگایا۔ یہ طے پایا گیا کہ آرٹیکل 184 کی کلاز 3 سپریم کورٹ کو اختیار دیتی ہے کہ وہ بنیادی حقوق کی تکمیل کے لئے اسی طور پر حکم جاری کرے جس طرح کہ ہائی کورٹ جاری کر سکتی تھی (زیر احکامات آرٹیکل 199) آرٹیکل 199 کی کلاز (C)(i) کہتی ہے کہ درخواست برائے تکمیل بنیادی حقوق اس شخص کو دینی چاہیئے جس کو کوئی رنج پہنچا ہو مگر اس کیس میں سائل

نے وہ درخواست دو حیثیتوں میں دائر کی یعنی کہ (1) ایک زیر حراست آدمی کی بیوی ہونے کی حیثیت سے اور (2) پاکستان پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئرمین ہونے کی حیثیت سے (وہ پارٹی جس سے سب زیر حراست اشخاص تعلق رکھتے ہیں)

13- دوسرے کیس میں یعنی مس بے نظیر بھٹو بنام فیڈریشن آف پاکستان (PLD 1988 SC416) جس کا اوپر ذکر آچکا، تھوڑا مختلف ضمن میں یہ طے کیا گیا کہ آرٹیکل (3)184 کے تحت سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار صرف رنجیدہ آدمی پارٹی کے کہنے پر نہیں (بابت غلط کارروائی سماعت و فیصلہ) اور حق کے روایتی قاعدہ کو چھوڑا جاسکتا ہے اور اس طریقہ کار کو جو کہ سرکاری مفاد میں مقدمہ بازی کے لئے موجود ہو استعمال میں لایا جا سکتا ہے (اگر ایسا مقدمہ عدالت میں رنجیدہ مظلوم شخص لائے) اس لئے کسی فرد یا جماعت کے بنیادی حقوق کی تکمیل کے لئے آرٹیکل (3) 184 کے احکامات میں وسیع پیمانہ پر گنجائش رکھی گئی ہے (ان کے انحراف خلاف ورزی کی صورت میں) اور یہ سپریم کورٹ کا کام ہے کہ کوئی عمومی حد لائن مقرر کرے تاکہ گروپ یا کلاس سے متعلقہ کاروائی عمل کو صحیح شکل دی جا سکے (ایک ایک کیس کو الگ الگ) سپریم کورٹ صرف اسی صورت میں حکم جاری کرنے کا اختیار استعمال کرے گی جبکہ سرکاری مفاد کی بات ملوث ہو۔ جبکہ آرٹیکل نمبر 199 کی تحتی آرٹیکل نمبر (C)(1) میں بہت وسیع گنجائش موجود ہے۔ کیونکہ اس میں کسی قسم کی حد مقرر نہیں ہے۔

14- اس کیس میں آرٹیکل (3)184 کو نہیں اٹھایا جاسکتا کیونکہ اسمبلی توڑنے

کا قابل اعتراض کام آرٹیکل نمبر(2)17 کے خلاف نہیں۔ کیونکہ سائل کے پاس کوئی بنیادی حق نہیں ہے جس کے تحت وہ اپنی معیاد پوری ہونے تک اپنی حکومت جاری رکھ سکے اور کیونکہ یہ چیز آئین کے دیگر احکامات کے ذریعے محفوظ ہے جن کا اوپر ذکر آچکا۔ آرٹیکل (2)17 جو کہ بنیادی حق کی گارنٹی دیتی ہے ایسے حق کا ذکر کرتی ہے (سیاسی جماعت کا ممبر ہونے کی حد تک) بشرطیکہ متعلقہ قانونی حدود کے اندر رہے۔ اور بس اس سے زیادہ نہیں معیاد ختم ہونے تک حکومت کرنا ایک سیاسی خواہش ہے اور سیاسی کاموں میں حصہ لینے کے لئے آئین کے آرٹیکلز کے تحت چلنا ہوگا۔ نہ کہ آرٹیکل (2)17 یہ آرٹیکل یعنی (2) 17 اس سیاسی جماعت کا ذکر کرتی ہے جس کے پاس بہت سارے حقوق موجود ہوں۔ (بشمول ان سیاسی حقوق کے جو کہ بنیادی حقوق کے علاوہ ہوں جن کا آئین میں ذکر کیا گیا ہے۔

Objective Resalution-2.A" میں درج شدہ اصول واحکامات (جو کہ لف شدہ کاغذ میں اسی طرح لکھ کر پیش کیا گیا) کو آئین کا مستقل حصہ بنایا جاتا ہے اور اسی طرح اس پر عمل کیا جائیگا"

16- امیر مندرجہ بالا میں دوسری دلیل یہ بنائی گئی ہے کہ قومی اسمبلی میں داخلے سے قبل۔ سیاسی جماعت کو بنیادی حق حاصل ہے اور داخلہ کے بعد 5 سال حکومت کرنا ایک سیاسی حق ہے جو کہ "سیاسی انصاف" کے تحت ملا جیسا کہ آرٹیکل 2-A میں درج ہے جو کہ بھی اتنا ہی بہتر ہے جتنا کہ معنوی بنیادی حق۔ فاضل وکیل نے مزید بیان کیا کہ مس بے نظیر بھٹو بنام فیڈریشن آف پاکستان وغیرہ کے کیس میں (PLD 1988 SC 419) اس وقت کے جج

صاحب جناب ظفر حسین مرزا صاحب نے "سیاسی انصاف" کے اس پہلو کو (اس کی تائید میں) رپورٹ کے صفحہ نمبر 460 پر درج کیا ہے۔ میں اس حق میں نہیں ہوں کہ فاضل وکیل کے موقف کو تسلیم کروں اس کی مندرجہ ذیل وجوہات میں آئین میں بنیادی حقوق صاف طور پر مذکور ہیں اور اگر صاف طور پر مذکور نہ ہیں تو کوئی ایسا "بنیادی حق" معنوی طور پر موجود ہونے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

اگر ایسا کر سکتے ہیں۔ یہاں اس ضمن میں کوئی جھگڑا نہیں ہے کہ آرٹیکل 2-A جس میں Objective Resolution ہے وہ اب آئین کا مستقل حصہ ہے اور یہ آرٹیکل اب اتنی ہی بہتر ہے جتنی کہ دوسری سب آرٹیکلز بہتر ہیں اور اس کے برابر ہیں۔ مندرجہ بالا "بے نظیر بھٹو کے کیس میں آئیں کے آرٹیکل (2) 17 کو (ممبر کے سیاسی جماعت بنانے۔ یا اس کا ممبر بننے کے حق کی روشنی میں) بمعہ متعلقہ قانونی بندشیں حدود) جانچا گیا۔ اور اس ضمن میں کئی احکامات (جو کہ پولٹیکل پارٹیز ایکٹ میں مزید دیئے گئے) پر غور کیا گیا اور اس بنیادی حق (کہ کوئی سیاسی جماعت بنائے یا اس کا ممبر بنے) کے خلاف پائے گئے۔ صحیح طور پر اس ضمن میں (یعنی کوئی سیاسی جماعت بنائے یا اس کا ممبر بنے اور صحیح انتخابات کے متعلق اور سیاسی جماعتوں کی موجودگی حیثیت سے متعلق) ظفر حسین مرزا صاحب (جج) نے رپورٹ کے صفحہ نمبر 460 مندرجہ ذیل اخذ کیا۔ :-

"سیاسی انصاف" کے الفاظ بہت معنی خیز ہیں اور ان کو بنیادی حقوق کے درجہ میں رکھا گیا "سیاسی جماعتیں" "بنیادی حق" کا اصل موضوع مقصد

بن چکی ہیں Objective Resolution کے مذکورہ احکامات کے عین مطابق) اس سے ہٹ کر بھی۔ وسط میں کہتے ہوئے۔ ہمارا آئین مرکزی آئین ہے۔ جو کہ پارلیمانی طرز کی نمائندہ حکومت کی بنیاد پر ہے جیسا کہ برطانیہ میں ہے مندرجہ بالا Resolution سے یہ واضح ہے کہ اسلام کے دئے گئے جمہوری اصول کے مطابق ٹھیک اور صاف انتخابات اور سیاسی جماعتوں کی حیثیت موجودہ گورنمنٹ کے جمہوری نظام سلسلہ کا ضروری اور لازمی حصہ ہیں"

17- مندرجہ بالا عبارت سے یہ صاف واضح ہے کہ "سیاسی انصاف" کا حوالہ اپنی نوعیت میں academic (تعلیمی) ہے کیونکہ بنیادی حق کا تذکرہ پہلے ہی آرٹیکل نمبر (2)17 میں آچکا ہے۔ جو کہ ایک سیاسی پارٹی بنانے یا اس کا ممبر بننے کا حق ہے۔ کیونکہ پولٹیکل پارٹیز ایکٹ کے کچھ احکامات مذکورہ بالا بنیادی حق کے خلاف تھے اس لئے ان کو ہٹا دیا گیا میری رائے میں مسٹر خالد انور کے کسی کو موقف آگے نہیں بڑھاتا (اس لحاظ سے کہ قومی اسمبلی میں داخل ہو جانے کے بعد حکومت کو 5 سال تک جاری سیاسی حق کی بنیاد پر ہے جس کا خالصتاً بنیادی حق سے تعلق ہے۔

18- مندرجہ بالا حقائق اور وجوہات کی بنا پر میری رائے ہے کہ سپریم کورٹ میں براہ راست درخواست دائر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ صرف اس صورت میں آرٹیکل (3)184 کا سہارا لیا جا سکتا ہے جبکہ سرکاری مفاد کا سوال ملوث ہو (بحوالہ تکمیل حقوق بنیادی) اور اس کیس میں سائل زیر آرٹیکل (2)17 بنیادی حق کا مطالبہ (کہ وہ اپنی حکومت کو معیاد ختم ہونے تک جاری رکھے) نہیں کر

سکتا سائل کے لئے درست طریقہ کار یہ تھا کہ وہ زیر آئیکل 199 ہائی کورٹ میں بذریعہ رٹ رجوع کرتا اور اس کے مطابق اپنی حاجت پیش کرتا۔ اور جس میں (رٹ میں) وہ صدر صاحب کے اسمبلی توڑنے والے حکم کو چیلنج کرتا۔

19- قابلیت (Merits) کی طرف واپس آتے ہوئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قابل اعتراض حکم کو صدر صاحب نے آرٹیکل (2)58 کے تحت جاری کیا ہے اس حکم کے مقصد اور دائرہ گنجائش کو صحیح زاویے سے سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہو گا کہ تاریخی پس منظر کو کچھ سامنے رکھا جائے ہم نے 1947ء میں آزادی حاصل کی۔ اور پہلی مرتبہ 1956 میں آئین پیش کیا۔ جس میں پارلیمانی نظام گورنمنٹ کا تصور دیا۔ 1958 میں ملک میں مارشل لاء نافذ ہوا۔ اور آئین کو منسوخ کیا گیا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے (جو صدر بنے) ملک کو 1962ء میں آئین دیا۔ جس میں صدارتی گورنمنٹ کا تخیل دیا گیا۔ صدر ایوب خان صاحب کے دور حکومت کے اختتام کے قریب لوگ ناراض سے ہو گئے اور گلیوں میں نکل آئے (بطور احتجاج) اب ایوب خان کے لئے ماسوا استیفی دینے کے اور چارہ کار نہ تھا اور ایسا کرتے وقت بجائے اس کے کہ وہ حکومت کی باگ ڈور قومی اسمبلی کے سپیکر کو سونپتے۔ انہوں نے فوج کے چیف کو ملک کا چارج لینے اور اپنا آئینی کردار ادا کرنی کی دعوت دی۔ فوج کے چیف نے مارشل لا نافذ کر دیا اور عام انتخابات کرائے۔ کچھ اور بھی سیاسی تبدیلیاں ہوئیں جس کے نتیجہ میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جنگ ہوئی اور نتیجتہً مشرقی پاکستان الگ ہو گیا اور بنگلہ دیش بن گیا۔

20- مغربی پاکستان میں انتخابات کا نتیجہ منظور کر لیا گیا اور نتیجتہً حکومت بنائی گئی

لور ایک نیا آئین پیش کیا گیا جس کو 1973 کا آئین کہتے ہیں یہ آئین بھی پارلیمانی طرز کی حکومت کا تصور دیتا ہے جس کے تحت سب سے زیادہ اختیارات وزیر اعظم کو دیئے گئے۔ 1977ء میں دوبارہ مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور آئین کو تعطل میں رکھ دیا گیا اس ملک نے کئی مارشل لاء دیکھے ہیں اور جب کبھی بھی مارشل لاء لگتا ہے فوجی حکمران یہ سمجھتے ہیں کہ اس ملک کے عوام کے لئے پارلیمانی طرز حکومت بہتر نہ ہو گا۔ اور ان کا رجحان صدارتی طرز حکومت کی طرف ہے۔ تاکہ حکومت مستحکم ہو اور زیادہ دیر تک رہے۔ یہی نقطہ نظر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر و صدر پاکستان جناب جنرل ضیاء الحق نے ذہن میں رکھتے ہوئے۔ بہت کاوش کی کہ ایسا سسٹم آجائے جس میں وزیر اعظم کی نسبت صدر کے اختیارات زیادہ ہوں۔ اس نے پارلیمانی طرز حکومت کو برقرار رکھنا نامناسب نہ سمجھا کیونکہ دوسری طرز (صدارتی نظام) کی حکومت کو جو ایوب خان نے پیش کی تھی عوام نے مسترد کر دیا تھا (وہ عوام جو گلیوں میں نکل آئے تھے) اس نے پارلیمانی طرز حکومت کو رکھنا چاہا (صدر کے زیادہ اختیارات کے ساتھ جس کی بات ہر معاملہ میں حرف آخر ہو اور اگر ضرورت پڑے تو وزیر اعظم کی حکومت کو ختم کر سکے۔ اس نے ترکی کے آئین کی لائن سے بھی سوچا کہ آئین میں نگران کا کردار فوج کو سونپا جائے۔

21- یہ قابل ذکر ہے کہ CMLA اور صدر ضیاء الحق نے 1973ء کا آئین منسوخ نہ کیا مگر اس کے کچھ احکامات تعطل میں ڈال دئے۔ جب مارشل لاء کے ختم ہونے اور 1973ء کا آئین بحال ہونے کا وقت آیا تو 2-3-85 کو حکم 1985ء (صدارتی) (1985ء کا 14) نافذ کر دیا گیا جس کے تحت آئین کو

کافی ترامیم کرنے کے بعد بحال کر دیا گیا (جیسا کہ صدر صاحب کو اپنی ضروریات کے مطابق درکار تھیں) اس ضمن میں آئین کی آرٹیکل 58 قابل ذکر ہے اور وہ اس وجہ سے کہ کلاز (2) آرٹیکل 58 میں شامل کی گئی جس کے تحت صدر صاحب کو اختیار دیا گیا کہ وہ قومی اسمبلی اپنی مرضی سے توڑ سکتے ہیں۔ جہاں اس کی رائے میں ایک اپیل (جماعت انتخابات کندگان کو) دینا ضروری ہے۔ اس ترمیم سے پہلے آرٹیکل 58 حکم دیتی تھی کہ صدر صاحب قومی اسمبلی توڑ سکیں گے (اگر ایسی ہدایت وزیراعظم کی طرف سے ملے) تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ کلاز (2) نے صدر صاحب کو خاص اختیار دیا جس کے تہت وہ قومی اسمبلی اپنی مرضی سے توڑ سکے۔ (جب کبھی وہ یہ خیال کریں کہ مذکورہ بالا اپیل ضروری تھی) اس چیز نے جھگڑا اختلاف باہت غیر محدود اختیارات صدر اور آئین کی شکل تبدیل کرنے (پارلیمانی نظام سے ہٹ کر جس کے نتیجے میں آئین (آٹھویں ترمیم) ایکٹ 1985ء معرض وجود میں آیا۔ جس کے تحت آرٹیکل 58 کی کلاز (2) کو مناسب حد تک تبدیل کر دیا گیا۔ اور صدر صاحب کو یہ اختیار پکا مل گیا کہ اپنی مرضی سے قومی اسمبلی کو توڑ سکیں گئے۔

22- آئین (آٹھویں ترمیم) ایکٹ 1985ء دراصل اس غرض سے تھا کہ صدر صاحب کے اور وزیراعظم کے اختیارات (صدر صاحب کی مرضی کے مطابق) کے درمیان توازن رکھا جائے اور اس غرض سے بھی تھا کہ ان عوام کی خواہش پوری کر دی جائے جو مارشل لاء اٹھانے کے حق میں تھے اور اس لئے بھی کہ آئین کو پارلیمانی طرز حکومت کے تحت چلانے کی شکل دی جا سکے۔ صدر صاحب مارشل لاء اٹھانے پر رضامند ہو گئے۔ اور آئین کو اس شرط پر بحال کر

دیا کہ ان کے نقاط نظر ملحوظ خاطر رکھے جائیں بشمول صدر صاحب کے مزید اختیارات تاکہ بعد میں کوئی ایسی صورت نہ پیدا ہو جائے جس سے مارشل لاء لگانا پڑے۔ان حالات میں سمجھوتہ کرنے کی کوششیں کی گئیں تاکہ اس رکاوٹ بندش کو ختم کیا جائے اور آئین کو موقع دیا جائے کہ وہ صحیح ثابت ہو سکے۔ دائرہ اختیارات کا ترجمہ اور گنجائش جس کا آرٹیکل (B)(2) 52 میں ذکر آیا، تفصیل جانچ پڑتال کے لئے سامنے لایا گیا۔ (فیڈریشن آف پاکستان وغیرہ بنام حاجی محمد سیف اللہ وغیرہ (PID 1989 Sc 166) کے کیس میں۔اس سوال پر دو نقاط نظر سامنے آئے (1) آیا کہ مندرجہ بالا اختیار مرضی بغیر کسی بندش کے ہے اور اس کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا (کسی بھی بنا پر جیسا کہ آرٹیکل 48 کی کلاز (2) میں حکم دیا گیا یا کیا یہ اختیاری طاقت ہے جس کو مناسب طور پر اور پورے طور پر اختیار کیا جانا چاہئے اور بذریعہ عدالتی نظر ثانی جانچ پڑتال کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں اس عدالت نے آئین (آٹھویں ترمیم) ایک 1985ء پر قومی اسمبلی میں بحثوں کا حوالہ دیا اور مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچی۔

"کہ قانون بنانے والوں کی غرض، جیسا کہ ان کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے اور اس لحاظ سے بھی کہ جس طرز پر قانون بنایا گیا تھا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صدر صاحب کا ایک حکم بابت توڑنے اسمبلی دے سکتے ہیں اور ایک اپیل انتخابات کندگان جماعت کو دی جا سکتی ہے مگر صرف اس صورت میں جب کہ گورنمنٹ کی ساری مشینری مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہو، اور اس کے اختیارات محدوم ہو چکے ہوں اور گورنمنٹ کو آئین کے احکامات کے مطابق نہ چلایا جا سکتا ہے"

جو یہ صدر کے اختیارات میں ہو گا کہ وہ جانچیں آیا کہ ہے ان شرائط کو پورا کیا گیا ہے کہ نہیں مگر یہ اختیار آئینی احکامات کی روح اور الفاظ کے مطابق استعمال کیا جائے گا اس لئے صدر صاحب کو آئین کی آرٹیکل (b)(2) 58 کے تحت دیئے اختیار کو مکمل اور کلی نہیں سمجھا جائیگا مگر اس اختیار کو متعلقہ قانون کی منشا کے مطابق ڈھالا گیا اختیار تصور کیا جائیگا"

"آرٹیکل (2) 48 کے احکامات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ صدر صاحب کو پہلے اپنی رائے قائم کرنا ہو گی (صحیح طور پر) اور پھر اپنا اختیار استعمال کرنے کے لئے آزاد ہے، جس طریقے سے بھی وہ چاہئے، یعنی خواہ اسمبلی کو توڑ دیں یا نہ توڑنے پر آمادہ ہوں خواہ آرٹیکل (2)48 کے تحت کوئی آزادی برائے (زیر آرٹیکل (2) 58) اٹھائے گئے اقدام کے خلاف موجود ہو تو وہ امکانی طور پر صرف اختیار استعمال کرنے کے متعلق ہو سکتی ہے مگر اس کی رائے سے متعلق نہیں مندرجہ بالا حکم آئین کے تحت صدر صاحب پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اپنا اختیار استعمال کرنے قبل ان کو اپنی رائے قائم کرنا ہو گی کہ آرٹیکل (b)(2) 58 کے مطابق ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے جس کے تحت قومی اسمبلی توڑنے کا انتہائی اقدام اٹھانا ضروری ہو گیا ہے۔

"لہذا اس طرح گو صدر صاحب خود صورت حال کا جائزہ لے سکتے ہیں اور یہ سوچ سکتے ہیں کہ ان کو اب اس صورت میں کیا اقدام اٹھانا چاہئے مگر ان کی رائے کسی مستحکم بنیاد پر ہونی چاہئے۔ (2) سیف اللہ کے کیس میں اہم بات یہ ہے کہ صدر ضیاء الحق صاحب نے اسمبلی توڑنے کا حکم جاری کیا جس میں تین وجوہات تھیں۔

(1) ملک میں قانون کی بالادستی ختم ہو چکی ہے اور ابتری پھیل چکی ہے جس کے نتیجے میں کئی قیمتی زندگیاں ضائع ہو چکی ہیں۔

(2) پاکستان کے شہریوں کی جائیداد عزت اور حفاظت محفوظ نہیں رہیں اور

(3) کہ ایسی صورت پیدا ہو چکی ہے جس میں آئین کے احکامات کے مطابق گورنمنٹ (حکومت) نہیں چلائی جا سکتی۔ ضیاء الحق کی وفات کے بعد ہائی کورٹ نے اپنی ججمنٹ / فیصلہ کا اعلان کیا۔ اس عدالت نے یہ فیصلہ کیا کہ اسمبلی توڑنے کا حکم ان تین وجوہات کی بنا پر صحیح نہ ہے کہ بنائی گئی وجوہات کے پیچھے کوئی ثبوت / چیز نہیں ہے۔

(2) نگران وزیر اعظم کو نفسات نہ کیا گیا اور (3) وزرا کے حلف تبدیل کر دیئے گئے۔ اسمبلی اور حکومت کو بحال کرنے کے لئے دی گئی درخواست کو مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر منظور نہ کیا گیا (1) محمد خان جانیجو (جو کہ سندھ سے تعلق رکھنے والے معزول وزیر اعظم تھے) نے عوام کی رائے / ووٹ لینے کا فیصلہ کیا (2) پاکستان مسلم لیگ (جو کہ اسمبلی میں حکومت کرنے والی پارٹی تھی) دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور اس کے دوسرے حصے کے سربراہ فدا محمد خان تھے۔ (3) پوری انتظامی مشینری کو انتخابات کے لئے حرکت میں لایا گیا۔ (4) Ban اٹھانے کے بعد سب سیاسی جماعتیں انتخابات میں حصہ لے سکتی تھیں (5) دائرہ رٹ کو صحیح طور پر انکار کیا گیا کیونکہ اگر بحالی سے متعلق عرض قبول کر لی جاتی تو بہت بڑا نقصان ہو سکتا تھا۔ اس ضمن میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ فرد کی نسبت قومی مفاد کو اولیت دی جائیگی اپیل کے مقابلے میں اختیار کو استعمال کرنے کے سوال پر مذکورہ فیصلہ / ججمنٹ میں سے متعلقہ پیرا حسب ذیل پیش کیا

جاتا ہے۔

"اس بات کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اسمبلی توڑنا کسی لحاظ سے بھی ممبران اسمبلی کے حقوق کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ اگر وہ یہ مطالبہ کریں کہ وہ لوگوں کی مرضی سے اسمبلی میں آئے ہیں' بطور ان کے نمائندے' اور نہ کہ صرف قانونی حکم کی وجہ سے) صحیح ہے تو وہ نئی دستور ساز اسمبلی کے لئے دوبارہ انتخابات کے لئے کوشش کریں کیونکہ اس اسمبلی کے ممبران بننے کے لئے وہ کسی عدم قابلیت کے حامل نہیں۔ اگر ان کو انتخابات کے لئے دوبارہ ووٹ/ رائے مل جائے تو وہ اسمبلی میں باعزت واپس جا سکتے ہیں اور اس چیز کو ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں نہ کہ اپنی۔

24- آئین کی آرٹیکل (B)(2) 58 کے تحت صدر (سندھ سے تعلق رکھنے والی مس بے نظیر بھٹو کی وفاقی حکومت نے دوسری دفعہ قومی اسمبلی توڑنے کا حکم جاری کیا جو کہ نامنظور ہوا اور آئینی درخواست اس گورنمنٹ کے وفاقی وزیر نے لاہور ہائی کورٹ میں دائر کی جو کہ نامنظور کر دی گئی۔

عدالت نے (خواجہ احمد طارق رحیم بنام فیڈریشن آف پاکستان وغیرہ یعنی (PLD 1992 SC 646) کے کیس میں) دائرہ/ گنجائش اور اختیار زیر آرٹیکل (b)(2) 58 کی دوبارہ جانچ پڑتال کی۔ اسمبلی توڑنے کے حکم کے ثبوت میں صدر صاحب نے پانچ وجوہات دیں اور ان وجوہات کے ثبوت میں مزید ثبوت دیئے۔ یہ پانچ وجوہات یہ تھیں۔

1- یہ کہ سیاسی مفاد کے حصول کے لئے سخت بدنام اور غلط سودے بازی ہو رہی ہے اور اس کے ذریعے سے قومی اسمبلی کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔

2- مرکزی حکومت نے آئین کے تحت کام کرنا مشکل بنادیا ہے اور Com-mon Intrests Council اور National Finance Com-mission کو کاٹ گئی ہے۔

3- کیونکہ مرکزی حکومت میں اس کے کارندوں میں محکموں میں اور دیگر اداروں بشمول بنکوں میں بدعنوانی اور خویش پروری ہے۔

4- مرکزی حکومت ناکام ہوگئی ہے کہ صوبہ سندھ کو اندرونی مصیبتوں سے بچا سکے۔

5- مرکزی حکومت نے آئین کے احکامات کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ اس طرح کہ اعلیٰ عدالتوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ محکوم کارپوریشنوں اور بنکوں وغیرہ کی طرح ذرائع اور سرکاری اداروں کو غلط استعمال کیا ہے۔ جو کہ سیاسی مقاصد اور ذاتی مفاد وغیرہ کے حصول کے لئے ہے۔ اس عدالت کے سب (12) ججوں نے اس کیس کی سماعت کی اور 10:2 اکثریتی رائے سے اسمبلی توڑنے والے حکم کو برقرار رکھا (مگر حکم کی مدد میں لائے گئے سب ثبوتوں وغیرہ پر خوب غور کرنے کے بعد) آرٹیکل (b)(2) 58 کے بارے میں حسب ذیل طے پایا گیا: یعنی :-

"صدر پاکستان صاحب کو اپنی مرضی سے قومی اسمبلی توڑنے کا اختیار ہے۔ اور خصوصی اختیار اور عدالتی ضروریات آئین میں موجود ہیں جب ایک دفعہ خراب چیز کی شناخت ہو جائے تو آئین کے تحت اس کو درست کرنے کے تدام فوری کرنے چاہئیں۔ سرکاری کارندے جن کو اختیار بطور امانت دیا یا ہے اور زیر حلف وفاداری دیا گیا ہے (کہ وہ غیر جانبداری سے اور اپنی تمام

صلاحیتوں سے کام کریں گے۔ان کو چاہئے کہ وہ اس کا ردعمل کریں کیونکہ وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے۔ایسا اختیار مختص رکھنے وغیرہ کے لئے اور اس کو استعمال کرنے کے لئے آئین میں واضح طور پر قانون اور اخلاقی بنیادیں موجود ہیں"

25- منتخب شدہ ممبران کی ناکامی / خرابی کے سوال پر (اگرچہ وہ متعلقہ قانون کے تحت نہیں پکڑی گئی) یہ طے پایا گیا کہ یہ چیز (یعنی ممبران کی ناکامی) ایسے ممبران میں رکھے گئے اعتماد کی خلاف ورزی ہے اور اخلاقی بنیاد پر اس وجہ سے اسمبلی توڑنا صحیح ہے یہ بھی طے پا گیا کہ صدر صاحب قومی اسمبلی توڑنے کے مجاز ہیں کیونکہ آئینی ادارے مثلاً Council of Common Interest اور نیشنل فنانس کمشن کو کام کرنے کی اجازت نہیں ہے۔لہذا آئینی ضرورت / فرائض ادا نہ ہوئے مختصراً یہ کہ جو کچھ ثبوت وغیرہ یعنی اسمبلی توڑنے والی وجہ کی اعداد میں لائے گئے۔وہ اس عدالت نے قبول کر لئے کیونکہ وہ ٹھیک تھے اور صدر صاحب کے اسمبلی توڑنے والے حکم کو بحال رکھا گیا۔کیونکہ وہ ٹھیک حکم تھا میں چاہوں گا کہ دونوں کیسوں کا مقابلہ کروں یعنی نمبر 1 خواجہ احمد طارق رحیم کیس اور نمبر 2 موجودہ کیس

تاکہ پتہ چلے کہ موجودہ کیس میں لایا گیا مواد (ثبوت وغیرہ) مندرجہ بالا کیس نمبر 1 کی نسبت زیادہ بھی ہے اور معتبر بھی۔اور آرٹیکل 58 (2)(b) کی تشریح وغیرہ کے لئے وہی پیمانہ اختیار کرنا چاہئے۔اور کسی لحاظ سے بھی اس عدالت کو مندرجہ ذیل کیسوں سے نہیں ہٹنا چاہئے یعنی نمبر 1 حاجی سیف اللہ خان کا کیس اور نمبر 2 طارق رحیم کیس۔

26-اس کیس میں۔ اسمبلی توڑنے والے حکم کے پیچھے آٹھ وجوہات ہیں۔ جن میں سے دو وجوہات کی مزید تحتی وجوہات بنائی گئی ہیں۔ طارق رحیم کیس میں پانچ وجوہات تھیں جو کہ اسمبلی توڑنے کی حکم کی امداد میں تھیں اور ان میں سے دو مزید تحتی وجوہات بنائی گئیں۔ اس کیس میں پہلی وجہ بہت سارے اپوزیشن ممبران کے استعفے ہیں بشمول Treasury بینچ کے ممبران اور وزراجن کی یہ خواہش ہے کہ دوبارہ انتخابات ہوں۔ جس کی وجہ سے قومی اسمبلی عوام کا اعتماد کھو بیٹھی ہے۔ اس عدالت میں دوران سماعت بہت سا وقت اس سوال پر لگ گیا آیا کہ مندرجہ بالا استعفے درست ہیں یا نہیں (وہ استعفے جو کہ سپیکر کی بجائے صدر صاحب کو دئے گئے) اور آیا کہ ان کو وہ استعفے منظور کرنا چاہئے تھے کہ نہیں یہاں صدر صاحب کو دیئے گئے استعفوں کے جائز/ضروری ہونے کا سوال نہیں (وہ استعفے کو اہمیت دینا ہو گی (اس وجوہ کی امداد میں کہ ممبران قومی اسمبلی سائل (وزیراعظم) کی مرکزی حکومت میں اپنا اعتماد کھو بیٹھے ہیں اور ان حالات میں صدر صاحب نے صحیح ضرورت محسوس کی کہ وہ اپنے اختیار کو زیر آرٹیکل 58 (2)(b) عملی جامعہ پہنا کر اسمبلی کو توڑیں (صورت حال کا خوب جائزہ لینے کے بعد)

27- تحریری بیان (جواب دعویٰ) میں یہ مذکور ہے صدر صاحب کو کل 88 استعفے ملے۔ جن کے علاوہ 12 سیٹوں کی جگہ پہلے ہی خالی تھی جو کہ پہلے استعفوں کی وجہ سے پیدا ہوئیں اور اس کے علاوہ ایک اور سیٹ بھی خالی تھی جو کہ ایک ممبر کی وفات کی وجہ سے پیدا ہوئی۔

ان حالات میں کل 217 ممبران میں سے صرف 101 سیٹیں خالی

ہو سکیں۔ اس سوال (یعنی کہ کب یہ استعفے Valid تصور کئے جائیں گے جس کے تحت سیٹیں صحیح طور پر خالی ہو جائیں) کی طرف جائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ صدر صاحب ان استعفوں پر غور کر سکتے ہیں تاکہ اپنی کوئی رائے قائم کریں۔ کہ ان 88 ممبران نے جنہوں نے استعفے دیئے مندرجہ بالا (دوسرے) لازمی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے پیمانہ کارخ تبدیل کر سکتے ہیں۔ یا نہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وزیر اعظم اور قومی اسمبلی کی وفاقی حکومت اپنا وقار قدر کھو بیٹھی ہے (اور وہ اس طرح کہ ان کی نمائندگی کا Role وہ نہیں رہا جو کہ پہلے (اس وقت) تھا جبکہ لوگوں نے ان کو ووٹ دیا تھا۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آئی۔ جے۔ آئی جس میں کئی جماعتیں شامل ہیں۔ نے اکٹھے انتخابات لڑے اور عوام نے اس کو ووٹ دیئے۔ نتیجتہً اس پارٹی نے حکومت بنائی مگر بعد میں کئی جماعتیں اس سے ہٹ گئیں۔ حتی کہ PML (جانیجو) دو حصوں میں بٹ گئی (دوسرا حصہ نواز شریف گروپ ہے) لہذا اسمبلی توڑنے کے وقت آئی جے آئی اسی طرح کا سیاسی جماعتون والا گروپ نہ تھا۔ جن کو ووٹ دے کر حکومت میں لایا گیا۔

28-جواب دعویٰ میں یہ مدعی علیہم کی طرف سے یہ بیان / واضح کیا گیا کہ استعفے سپیکر کو نہ بھیجے گئے۔ کیونکہ وہ کٹر قسم کے آدمی ہیں اور انہوں نے ماضی میں وزیر اعظم و دیگر وزرا کی منشا کے مطابق کام نہ کیا۔ سپیکر صاحب خصوصی (ترجیع) سلوک حاصل کر رہے تھے اور وہ اس طرح کہ ان کو اپنے حلقہ کے لئے خصوصی Fund مل رہے تھے ان حالات میں (بطور احتجاج) استعفے صدر صاحب کو دیئے گئے جیسا کہ پہلے بیان ہوا۔ میری یہ رائے ہے کہ صدر صاحب

ن استعفوں پر غور کر سکتے ہیں۔ (اسمبلی توڑنے والی اس وجہ کی امداد میں کہ قومی اسمبلی اپنا اعتماد/وقار نمائندگی کھو بیٹھی ہے) اس کیس میں یہ زیادہ تر پایا گیا ہے کہ صدر صاحب استعفے وصول کرنے کے مجاز نہ تھے۔ لہذا اسمبلی توڑنے کے لئے یہ کوئی اچھی وجہ نہ تھا میں اس رائے سے اختلاف کرنے کی جسارت کروں گا۔ کیونکہ نمبر 1 طارق رحیم کے کیس میں 'سودے بازی کو اسمبلی توڑنے کی وجہ تصور کیا گیا (باوجود اس کے کہ یہ بات متعلقہ قانون کے تحت ثابت نہ ہو سکی) اور نمبر 2 یہ چیز (سودا بازی) دونوں جانب سے تھی۔ نمبر 3 اخلاقی وجوہات کی بنا پر منتخب شدہ ممبران کی ناکامی کو مان لیا گیا اس ضمن میں طارق رحیم کے کیس میں مندرجہ ذیل اکثریتی فیصلہ پیش کرتا ہوں۔ یعنی کہ :-

"سب سے پہلے اگر کوئی ممبر منشور کی بنیاد پر منتخب ہوتا ہے یا اس وجہ سے منتخب ہوتا ہے کہ وہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہے یا اس وجہ سے کہ وہ عوام کے مفاد میں کوئی خاص نقطہ نظر/موقف رکھتا ہے تو اس کی ناکامی اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کے مترادف ہے (وہ اعتماد جو عوام اس میں رکھتے ہیں) اگر اس کا ضمیر اس کو اس طرح حکم دے۔ یا وہ اس کو مصلحت آمیز سمجھے تو صرف اور صرف (اس کے لئے) حل استعفے ہے تاکہ وہ اپنے غلط کاموں سے پرے ہو جائے اور پھر دوبارہ انتخاب لڑے۔ اس سے اس کو عزت ملیگی اور سیاست شفاف ہو گی اور بااصول لیڈری ملنے کے امکانات نکلیں گے۔ دوسری اور ضروری بات یہ کہ سیاسی اپنے ہی نمائندہ کی طرف سے ایسی گمراہی کی وجہ سے بے یارو مددگار ہو گیا ہے عام حالات میں انتخاب کنندہ کو سالہا سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ (آئندہ انتخاب ہونے تک) ایسے آدمی کو چھوڑنے کے لئے اسی

دوران۔ وہ ناکام شخص پھلتا پھولتا ہے اور سب دنیاوی فائدے اٹھاتا رہتا ہے۔
تیسرا یہ کہ ایک اسلامی مملکت کے معیاری آئین کو یہ تباہ کر دیتا ہے۔ آئین کی معیاری مضبوطی یہ بتاتی ہے کہ روح زمین پر ساری حکومت واحد اللہ تعالیٰ کی ہے اور پاکستان کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اختیارات استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کی ایک مقدس امانت ہے اور حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ منتخب نمائندے چن کر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ وہ منتخب شدہ نمائندہ جو کہ اپنے فرائض میں کوتاہی کرے یا اپنی جماعت یا ووٹ دینے والوں کی خواہشات کا احترام نہ کرے۔ تو وہ اپنا وقار نمائندگی کھو بیٹھتا ہے۔ وہ حکومتی اختیارات کے استعمال کرنے میں حصہ نہیں لے سکتا (آئین کے تحت لئے گئے ووٹ کے ذریعے) حتیٰ کہ خالصتاً دنیاوی معیار سے بھی۔ ایسی ناکامی / خرابی کے پیش نظر اور ان خرابیوں کی بنیاد پر حکومت کو جاری رکھنا کچھ نہیں ماسوا کہ جمہوریتی آئینی کاروائیوں کا مذاق۔

29- ایسی ناکامیوں / خرابیوں سے متعلق اخلاقی وجوہات کی بنا پر (مندرجہ بالا) ایسی چیزیں کیوں نہیں لاگو کی جارہی ہیں جس کی ذریعہ اس کیس میں بہت سے آئے ہوئے استعفوں کا (بغیر ان کے Valid ہونے کے اعتراض کے) فیصلہ کیا جاسکے۔

30- دوسری وجہ جو کہ اسمبلی توڑنے والے حکّم میں (بطور (b)) دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ صدر صاحب اور وزیراعظم صاحب کی میٹنگ میں (خاص کر آخری ایسی میٹنگ جو 14-4-93 کو ہوئی) میں صدر صاحب نے وزیراعظم صاحب کو پرزور تاکید کی کہ وہ داخلی اور خارجی درپیش مشکل معاملات کے خلاف کوئی

ٹھوس اقدام اٹھائیں۔ مگر ایسا کرنے کے بجائے 17-4-93 کو وزیراعظم صاحب نے ٹی وی پر ایک تقریر کی اور غلط اور من گھڑت الزامات صدر صاحب کو لگائے جو کہ ملک کے سربراہ ہیں اور پورے ملک کی نمائندگی کرتے ہیں تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ حکومت کو آئین کے مطابق نہیں چلایا جاسکتا اور وزیراعظم نے اس ضمن میں اپنی وجوہات اور تھیوری بتائیں۔ جو کہ حکومت کے مفاد میں پوری کر دی گئیں۔ اور ان حالات میں وزیراعظم کی تقریر ''ہنگاموں کے بلاوے'' کی مترادف دی۔ اور بہر حال ان کی تقریر اور طرز رویہ آئین کی روح کے خلاف تھا ایسی تقریر کا نہ انکار ہے نہ ہی کوئی بحث جھگڑا

31- عدالت میں دائر کی گئی درخواست کے پیرا نمبر 4 اور اس سے آگے تک مرکزی حکومت کے اچھے کاموں کو سراہا گیا ہے اور پس منظر بیان کیا گیا ہے سائل کے مطابق I J I حکومت نے افغانستان میں ایک ''معاہدہ امن'' کرایا۔ سڑکوں کے نئے پراجیکٹ میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ جس کے تحت اندرونی اور بیرونی سرمایہ کاری کے وسیع مواقع بڑھے۔

سائل (وزیراعظم صاحب) نے سرمایہ کاری کے لئے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ سندھ میں کچی زمینیں۔ زمین نہ رکھنے والے حاریوں کو الاٹ کر دی گئیں۔ سائل کے مطابق ایسی سب ترقیاتی امور (بغیر صدر صاحب کے) انہوں نے اکیلے گئے۔ جس کی وجہ سے وہ ناراض ہو گئے اور انہوں نے عام اور روزمرہ کے معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا یہ اس لئے کیا گیا تاکہ مرکزی حکومت کے اختیارات اور ساکھ کو کھوکھلا کیا جائے اور یہ باور کرانے کے لئے کہ قومی معاملات میں اصل چیز صدر کی مرضی ہے نہ کہ عوام کی یا ان کی منتخب شدہ

نمائندوں کی درخواست میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکمران جماعت نے یہ بہتر سمجھا ہے کہ آئین کی آٹھویں ترمیم کی کچھ آرٹیکل میں ترمیم کی جائے اور اس بات سے صدر صاحب مزید ناراض ہوئے۔

32- درخواست میں یہ بھی درج ہے کہ حکمران جماعت صدر صاحب کو ہٹانا نہیں چاہتی لہذا کھلم کھلا کہا کہ وہ دوسری ٹرم میں ان کے ساتھ ہیں ان کو پورا یقین دلانے کے لئے حکمران جماعت نے آٹھویں ترمیم والی بات بھی ترک کر دی۔ ان سب اقدام کے باوجود (جو کہ حکمران جماعت نے کئے) صدر صاحب نے سائل کے رویہ کو غلط رنگ دیا۔ اور انہوں نے کھلم کھلا گورنمنٹ کے خلاف لوگوں کی حمایت شروع کر دی (وہ لوگ جو گورنمنٹ کو کمزور کرنے کی تجویزیں بنا رہے تھے) درخواست میں مزید لکھا ہے کہ وہ عوام جو منتخب حکومت کے خلاف تھے صدر صاحب کو ملتے رہے اور عام بیانات دیتے رہے کہ صدر صاحب عنقریب گورنمنٹ کو ختم کرنے کا اعلان کریں گے۔ اور صدر صاحب نے ایسے بیانات کی نفی نہ کی۔ بالاخر 14-4-93 کو وزیراعظم صدر اسحاق کو ملے اور ملاقات کے بعد صدارتی دفتر سے خبر جاری ہوئی (اخبار میں) جس میں مکمل صحیح طور پر میٹنگ کی تفصیلات نہ تھیں اور ان حالات میں 17-4-93 کو سائل مجبور ہو گیا کہ قوم کو اعتماد میں لے اور وہ تقریر کی۔ درخواست میں درج ہے کہ 18-4-93 کو ممبران قومی اسمبلی کی طرف سے اجلاس بلایا گیا تاکہ غور و خوص کیا جائے آیا کہ Ijl حکومت اپنا وقار کھو بیٹھی ہے کہ نہیں اور تاکہ وزیراعظم کی مذکورہ تقریر پر غور کیا جائے اور صدر صاحب کا مورخہ 14-4-93 کا اخباری بیان پر غور کیا جائے دونوں (صدر اور وزیراعظم) کو

بھی مدعو کرنے کی تجویز تھی۔ مگر بدنیتی کی بنا پر ایسے اقدام کو روک دیا گیا (اسمبلی توڑنے کے حکم کے ذریعہ سے)

یہ چیز کس حد تک قابل یقین ہے۔اس پر ابھی دیکھنا ہے۔

33- صدر صاحب نے تحریری بیان میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ وزیر اعظم ضروری پالیسی معاملات پر کام کر رہے تھے اور وہ مکمل طور پر احکامات آئین سے ہٹ کر چل رہے تھے اور اپنے آپ کو چند ایسے افراد کے ہاتھ میں دے رکھا تھا جو ان کی ٹھیک رہنمائی نہ کرتے تھے اور ان کی اس بات کو کابینہ کے بعض خاص ممبران ناپسند کرتے تھے یہ غلطیاں ان پر (اجلاسوں میں جو مارچ/اپریل 93ء میں ہوئے) واضح کر دیں گئیں اور وزیر اعظم نے کمزوریوں اور بے قاعدگیوں پر غور کیا اور ان کو درست کرنے پر رضامند ہو گئے۔ ایسا آخری میٹنگ/اجلاس 14-4-93 کو ہوا۔ جس کے اختتام پر وزیر اعظم نے درستگی کی اہم ضرورت کو مانا اور وعدہ کیا کہ وہ صدر صاحب کے پاس جائیں گے۔ کچھ درستگی کے اقدامات کرنے کے بعد) مگر ایسا کرنے کے بجائے 14-4-93 کو ٹی وی وغیرہ پر ایک تقریر کی۔ جس تقریر کو ہر شخص نے ایک "مثالی تقریر" کہا اس تقریر میں وزیر اعظم نے ایک انوکھا طریقہ چنا (یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مرکزی حکومت کو آئین کے مطابق نہیں چلایا جا سکتا۔ تقریر کے آخر میں وزیر اعظم نے کہا کہ وہ استعفے نہیں دیں گے۔ اور اسمبلی ختم نہ کریں گے اور وہ کسی کے نیچے رہ کر نہیں چلیں گے۔

34- جواب درخواست میں یہ درج ہے کہ وزیر اعظم کی مندرجہ بالا تقریر کے بعد۔ دوسرے ہی دن۔ سپیکر صاحب نے 19-4-93 کو قومی اسمبلی کا اجلاس

طلب کر لیا (ممبران کے کہنے پر) اور اس مقصد کے لئے سپیکر صاحب جلدی (اصل وقت سے پہلے) نیو دہلی سے واپس آگئے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپس میں ملے ہوئے تھے۔ سماعت کے دوران ہمارے سامنے (وزیر اعظم کی طرف سے) (ان کی تقریر اور مندرجہ اجلاس بلانے کے ثبوت میں) کی دلائل لائے گئے۔ یہ کہا گیا کہ ہمارے آئین (جو کہ پارلیمانی طرز حکومت بتاتا ہے) کے تحت صدر وزیر اعظم کے نیچے ہوں گے نہ کہ ان کے اوپر۔ 14-4-93 کے آخری اجلاس کے بعد (گو وزیر اعظم نے اپنے کو درست کرنے کا وعدہ کیا تھا) مگر وقت بہت کم تھا اور وہ مجبور ہو گئے کہ عوام کو اپنے اعتماد میں لیں اور اس مقصد کے لئے انہوں نے مندرجہ تقریر کی۔ کوئی ایسا ثبوت / شہادت نہیں لائی گئی جو بتائے کہ وقت میں توسیع کی بات کوئی گذارش کی گئی ہو۔ جس سے صدر صاحب انکاری ہو گئے ہوں۔

35- ایک اور دلیل یہ ہے کہ اگر کوئی میٹنگ کی تفاصیل کے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے (جس کے متعلق دفتر صدر نے اخبار میں خبر دی) اور جس کو وزیر اعظم نے نا درست گردانا۔ تو پھر یہ ایسا معاملہ ہے کہ اس کو صدر صاحب اور وزیر اعظم صاحب ایک اور میٹنگ کر کے طے کر سکتے ہیں۔ درخواست اور جواب درخواست کے ساتھ لف شدہ دیگر کاغذات اور اس بارے میں اخباروں کی کٹنگ (جو اس کیس میں دونوں جانب سے موصول ہوئے ہیں) اصل بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ صدر صاحب نے وزیر اعظم کو کہا کہ کچھ وزرا اور کچھ دیگر ضروری کاروندوں کو ہٹا دیں اور اس کام کے لئے وزیر اعظم نے کچھ وقت مانگا مگر بعد میں بدل گئے اور مخالفت کی روش اختیار کر لی۔ مندرجہ بالا 17-4-93

کی تقریر کے بعد (جسمیں صدر صاحب لی ذات/عہدہ/دفتر پر عجیب سی تنقید کی گئی) دوسرے ہی دن ممبران کے ایما پر قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کر لیا گیا۔ جو کہ ایک مناسب اقدام نہ تھی کیونکہ اجلاس طلب کرنے کے متعلق پہلے ہی "ایسی گذارش" موجود تھی اور اس سمری کو صدر صاحب نے منظور کیا اور اس پر دستخط کئے (جس طرح کہ اس عدالت کو فاضل اٹارنی جنرل نے بتایا ہے)

36- یہ دوسرے ہی دن اجلاس اچانک طلب کر لینا کئی خیالات دیتا ہے۔ (اس پس منظر میں صدر اور وزیراعظم کے تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے۔ اور پھر وزیراعظم کی مندرجہ تقریر جس میں انہوں نے قوم سے خطاب کیا) یہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ یہ صدر صاحب کے خلاف الزام بازی کا کام کرنے کے لئے تھا یا پھر کوئی ایسی وجوہ گھڑنے کے لئے تھا جس کے تحت صدر صاحب زیر آرٹیکل 152 (2)(b) اسمبلی توڑنے کا حکم جاری کرنے کے قابل نہ رہیں اس خیال سے کہ احکامات آئین کے تحت بلایا گیا اجلاس کو صرف سپیکر صاحب ہی کینسل کر سکتے ہیں دوسری طرف مدعی علیہم کی طرف سے یہ دلیل آئی کہ زیر آرٹیکل 52 (2)(b) دائرہ اختیار خود مختار/حتمی ہے اور اس کے تحت اسمبلی توڑنے کا حکم صدر صاحب جاری کر سکتے ہیں (چہ جائیکہ اسمبلی اجلاس کر رہی ہو) مسٹر خالد انور نے یہ پرزور کہا کہ وزیراعظم کی تقریر کسی لحاظ سے آئین کے منافی نہ ہے کیونکہ بطور وزیراعظم وہ ہمیشہ قوم کو مخاطب کر سکتے ہیں اور اہم معاملات میں عوام کو اپنے اعتماد میں لے سکتے ہیں ایک اور دلیل وزیراعظم کی طرف سے آئی کہ اسمبلی توڑنے والے حکم کے آخری پیرا میں یہ درج ہے کہ وزیراعظم کو برطرف کیا جاتا ہے اور یہ کہ لفظ "برطرفی" نہیں استعمال ہونا چاہئے تھا اور اس

طرح کرنے سے آئین کی آرٹیکل 14 کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ جس میں درج ہے کہ آدمی کی عزت اور قانون کے مطابق گھر کی Privacy ضروری ہے۔

37- میری رائے میں۔ اس بارے میں۔ سب سے ضروری/اہم اور نمبر 1 پر وزیراعظم کی تقریر ہے جس کے متعلق کوئی جھگڑا نہیں۔ لیکن اس کے بالکل خلاف وہ اس لحاظ سے ٹھیک نہ کہی گئی ہے کیونکہ وزیراعظم نے یہ کام آئین کے تحت دئے گئے اختیار کے تحت کیا اور صدر کا کوئی حق نہ تھا کہ وزیراعظم کو (پارلیمانی طرز حکومت میں) ہدایت کرتے۔ وزیراعظم کی تقریر سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے قوم کو اعتماد میں لینے کی کوشش کی (کہ ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے کہ مرکزی حکومت کو احکامات آئین کے تحت چلانا دشوار ہو گیا ہے اور یہ کہ ایسی صورت پیدا ہو جانے میں ان پر کوئی الزام نہ آنے چاہئے اور یہ کہ ایسا الزام صرف دفتر صدر پر اور ذات صدر پر ہونا چاہئے جو کہ باہر اور حکمران پارٹی کے اندر لوگون سے (اندر ہی اندر) مل گئے (وہ افراد جو حکومت کو کمزور کرنے پر کمربستہ تھے)

38- میری رائے میں یہ امر کہ ایسی صورت پیدا کرنے کا الزام کس پر لگایا جائے پس منظر میں ہے اور یہ بات (کہ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے جس سے مرکزی حکومت کے دونوں ستونوں کے تعلقات میں تعطل پیدا ہو گیا ہے) ایک عجیب سی بات ہو گئی ہے جس کی وجہ سے صدر صاحب زیر آرٹیکل (b) (2) 52 کے تحت اپنی مرضی/اختیار استعمال کر سکتے ہیں۔ اس چیز کا جھگڑا نہیں کہ وزیراعظم صاحب کی مندرجہ بالا تقریر (جس میں مخالفت کا لہجہ تھا۔

نہ کہ صلح کا) کے بعد۔ اور اس سے خوب واضح ہوتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ صاف صاف بتادیا گیا کہ صدر صاحب اور وزیر اعظم کے درمیان (کام کرنے کے) تعلقات معطل ہو چکے ہیں اس لئے مرکزی حکومت کو احکامات آئین کے تحت چلانا مشکل ہو گیا ہے۔ اور (منتخب کندگان کو) اپیل کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ مسئلہ کو عدالت کی یک طرفہ (وزیر اعظم کو) دی گئی پیشکش کے ذریعہ سے حل کیا جائے گا (اس یقین دہانی کے لئے کہ اگر حکومت بحال کر دی گئی تو وہ صدر صاحب کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کام کرینگے۔ صدر صاحب کو ایسی پیشکش نہیں کی گئی۔ عمل اور رد عمل برابر ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔ اس تقریر سے صدر صاحب کو افسوس ہو سکتا تھا اور بے عزتی محسوس کر سکتے تھے۔ ایسا کوئی معاہدہ (مابین فریقین) نہ ہوا جس سے یہ کہا جا سکے کہ انہوں نے اپنے اختلافات کو طے کر لیا اور پرانے سب رنج دفن کرتے ہوئے پورے خلوص کے ساتھ آپس میں صلح کر لی۔

39- آئین کی سکیم اس طرح ہے کہ دونوں (وزیر اعظم صاحب اور صدر صاحب) مرکزی حکومت کی مشینری کے بڑے پرزے ہیں۔ اور دونوں کو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر بہترین فضا میں کام کرنا ہے۔ تاکہ حکومت اور دیگر انتظامی روزمرہ کے معاملات نمٹا سکیں۔ (جو کہ وزیر اعظم کی ہدایت پر صدر صاحب نے کرنے ہوتے ہیں) اور اس سلسلہ میں "سمری ہائے" صدر صاحب کو برائے منظوری ارسال کرنا ہوتی ہیں۔ تو اگر صدر صاحب تعاون نہ کریں تو کیا حشر ہو گا۔

40- میں یہاں یہ باور کرانا چاہوں گا کہ طارق رحیم کے کیس میں صورت حال زیادہ ابتر نہ تھی اور وزیر اعظم مس بے نظیر بھٹو صاحبہ نے کوئی تقریر ایسی نہ کی تھی جس کے ذریعہ سے وہ کھلم کھلا صدر صاحب کی ذات اور عہدہ/دفتر پر تنقید کرتیں۔ ایسی تقریر کے عدم موجودگی میں۔ ظاہر کھلم کھلا اختلافی صورت حال پیدا نہیں ہوئی تھی۔ (جیسا کہ موجودہ کیس میں پیدا ہوئی) جس کا یہ مطلب ہے کہ اسمبلی توڑنے کی وجوہات کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے۔ اگرچہ اس کیس کی نسبت اس کیس میں وجوہات بالکل تھوڑی سی تھیں۔ اور اس کے سہارے میں دئے گئے مواد (ثبوت وغیرہ) ہر لحاظ سے گھٹیا (کم درجہ کے) تھے۔ مگر پھر بھی اسمبلی توڑنے والے حکم کو بحال رکھا گیا (جبکہ اس کیس میں نہیں)۔

41- اس کیس میں وجوہ نمبر (3)(Annex.C) جو کہ اسمبلی توڑنے والے حکم میں دی گئی وہ یہ ہے کہ آئین کے تحت قائم شدہ اداروں کی پروا نہیں کی گئی اور اس لحاظ سے مرکزی حکومت صوبوں کو دی گئی خود مختاری کی حفاظت نہ کر سکی۔ اس ضمن میں دی گئیں مثالیں یہ ہیں :-

کونسل آف کامن انٹرسٹ اور نیشنل اکنامک کونسل۔ اور اس کی ایگزیکٹو کمیٹی جن کی (مالیاتی۔ تجارتی اور اقتصادی پالیسیوں کے بارے میں تجاویز بنانے میں) پروا نہیں کی گئی (ان کو کاٹ دیا گیا) یہ کہا گیا ہے کہ صنعت کو پرائیویٹ کرنے کے بارے میں (بحوالہ فیڈرل لیجسلیٹو لسٹ کے حصہ دوئم کی آئٹم نمبر 3 اور Concurrent Legislatiue List کی آئٹم نمبر 34) آئینی فرائض زیر آرٹیکل 154/ 153 پورا کرنے کے لئے کامن انٹرسٹ کونسل کا تفصیلی مجموعہ بتاتی ہے جس میں صوبوں کے وزراء اعلیٰ بھی شامل ہیں

اور مرکزی حکومت میں سے برابر تعداد کے ممبران بھی شامل ہیں (وہ ممبران جن کو وزیراعظم نامزد کریں) اس آرٹیکل کی کلاز نمبر 3 میں ہے کہ اگر وزیر اعظم کونسل کا ممبر ہو تو وہ کونسل کے چیئرمین ہوں گے۔ مگر اگر وہ (کسی وقت) اس کے ممبر نہ ہوں تو صدر صاحب ایک مرکزی وزیر کو نامزد کر سکتے ہیں جو کہ کونسل کا ممبر ہو۔ (اس کا چیئرمین بننے کے لئے) یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس کیس میں وزیراعظم اس کونسل کے چیئرمین ہیں اور کونسل کا اجلاس بلانے میں ناکام رہے ہیں (صنعت کو پرائیویٹ کرنے کے بارے میں پالیسیاں بنانے کے لئے) جو کہ صوبوں کے لئے نہایت اہم معاملہ ہے۔

42- فاضل اٹارنی جنرل صاحب نے یہ بیان کیا کہ آرٹیکل نمبر 154 کے مطابق یہ ضروری ہے کہ کونسل پالیسیاں بنائے گی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ اس لئے صوبوں کو رنج پہنچا۔

کیونکہ ان کو اعتماد میں نہ لیا گیا۔ اگر ایسا اجلاس بلا لیا جاتا تو صوبے اپنے دُکھوں کی آواز اٹھاتے۔ درخواست میں ایسے الزام سے عمومی انکار ہے۔ اور لکھا ہے کہ 6000 ملین روپے 1991-92 میں سرحد (NWFP) گورنمنٹ کو دئے گئے (جو کہ مرکزی حکومت نے اس صوبے میں واقع ہائیڈرو الیکٹرک سٹیشن سے کمائیے گئے منافع سے دئے) جواب درخواست میں مرکزی حکومت نے اس امر کو درست قرار نہیں دیا۔ اور یہ کہا گیا کہ حکومت بلوچستان کو 1991-92 / 1992-93 کا پورا حصہ ادا نہیں کیا گیا جس کے متعلق مذکورہ صوبائی گورنمنٹ نے شکایت بھی کی تھی۔ مدعی علیہم نے اس کے ثبوت میں کئی دستاویزات دائر کیں۔ درخواست میں یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ

صرف دو خاص مثالیں دی گئی ہیں (آئینی اداروں مثلاً C.C.I اور N.E.C اور اس کی انتظامی (Executive) کمیٹی سے مشورہ نہیں کیا گیا۔ صدر صاحب کے آئے ہوئے Comments کے جواب میں متعلقہ وزیر نے اس نقطہ کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اور ایک تفصیلی رپورٹ کیبنٹ سیکرٹری نے 15-4-93 کو صدر صاحب کو ارسال کی۔

43- پرائیویٹ کرنے کی پالیسی کے بارے میں درخواست میں یہ لکھا ہے کہ اس کو پہلی مرتبہ صحیح عملی جامعہ پہنایا گیا۔ کچھ کارخانوں کو 1977ء اور 1985ء کے درمیان پرائیویٹ کر دیا گیا اور ایک ''غیر سرمایہ کاری'' کمیٹی قائم کی گئی 1989ء میں اس وقت کی حکومت نے 14 خاص کارخانے (ان کو پرائیویٹ کرنے کے لئے) چنے اور کئی نئے قوانین بنے تاکہ 1978ء سے ''غیر سرمایہ کاری'' پالیسی پر عمل کیا جائے اور آنے والی کسی حکومت نے بھی C.C.I سے مشورہ نہ کیا۔ سائل نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ زیر آرٹیکل نمبر 70 بل متعارف کرانے اور ان کو پاس کرنے کے لئے طریقہ قانون سازی دیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں پارلیمنٹ نے متعلقہ قوانین پاس کئے۔ جن کو صدر صاحب نے بغیر اعتراض کے پاس/منظور کر لیا۔ ہماری توجہ آرٹیکل 97 کی طرف بھی مبذول کرائی گئی ہے۔ جو کہ مرکز کی Executive اتھارٹی کی حد سے متعلق ہے (ان قوانین کے بنانے کے بارے میں جو کہ صوبوں میں لاگو کرنے ہوتے ہیں) اس ضمن میں فاضل اٹارنی جنرل نے کہا کہ سائل نے آرٹیکل 97,70 154 اور 173 کا غلط ترجمہ کیا ہے۔ مرکزی کی Executive اتھارٹی کے سوال کو صرف آرٹیکل 160/161 کی شرائط کو پورا کرنے کے بعد ہی اٹھایا جا

سکتا ہے۔ تمام مذکورہ بالا امور سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ آرٹیکل نمبر 154 کی اہم ضرورت کو پورا نہیں کیا گیا اور C.C.I کو پالیسی بنانے کے لئے نہیں طلب کیا گیا جس سے صوبوں کو موقع ملتا کہ کاروائی میں (ایسے خاص مرحلے پر) وہ حصہ لے سکتے۔

44- اسمبلی توڑنے والے حکم میں دوسری وجہ (وجہ نمبر (d)) ہے۔ جو مرکزی حکومت میں بدانتظامی۔ رشوت ستانی اور خویش پروری سے متعلق ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ پرائیویٹ کرنے والے کام کو شفاف کرنے میں کمی رکھی گئی ہے۔ مدعی علیہم نے یہ کہا ہے کہ مندرجہ بالا کام کو شفاف نہیں کیا گیا۔ اور اس کو مختلف بے قاعدگیوں اور غیر قانونی اقدامات کے ذریعہ سے تباہ/ ناکام کیا گیا۔ بغیر صحیح طریقہ اپنائے کارخانوں کو اپنے پیاروں کے نام تبدیل کر دیا گیا اور کارخانوں کی مالیت کی تقرری کا طریقہ بھی غلط تھا۔ قیمت فروخت کی وصولی مقررہ وقت کے اندر اور مقررہ طریقہ سے کی گئی۔ جس سے قومی خزانہ کو بہت نقصان پہنچا۔ فروخت / ٹرانسفر کے طریقہ کار نے کارخانے خریدنے والوں کے لئے یہ راہ ہموار کی کہ فروخت شدہ کارخانوں میں تیار ہونے والے مال کی قیمتوں میں گڑبڑ کر سکیں اور (صارف کے نقصان پر) وہ راتوں رات امیر بن جائیں۔ سیمنٹ کی آٹھ فیکٹریاں ایک صنعت کار گروپ کو فروخت کر دی گئیں۔ اور جس طریقہ سے مسلم کمرشل بینک کو مسائل کے پیادوں (یعنی منشاء گروپ) کے آگے فروخت کیا گیا۔ خوب مشہور طریقہ ہے۔ مرکزی حکومت کی جائیداد (بشمول کارپوریشن) کو فروخت کرنا غیر آئینی ہے۔ اور ایسا کرتے وقت مسائل اور ان کی حکومت نے آرٹیکل 153, 154 اور 156 /161

کی خلاف ورزی کی ہے۔

45-پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن کارپوریشن کے متعلق سائل اور ان کی حکومت غیر ملکی مشیروں کی خدمت لینے کی حد تک چلے گئے۔ اور پیشگی قانون تیار کروالیا۔ (برائے نج کاری) اور وہ اس طرح کہ صرف غیر ملکی ہی اس (صنعت) کو خرید سکیں۔ اس بارے میں وزارت قانون و انصاف سے مشورہ نہ کیا گیا۔ غیر ملکی سرمایہ کار کو مجوزہ کارپوریشن میں حصہ کا صرف 26 فیصد خریدنا تھا۔ جبکہ گورنمنٹ پاکستان کے پاس اگرچہ 74 فیصد تھا۔ کو ووٹ کا کوئی حق نہ دیا گیا۔ ٹیکس کی چھوٹ غیر ملکی خریدار کو دینے کی بھی تجویز کی گئی۔ خریدار ایک حکومت کے اندر ایک حکومت ہو گا۔ ایسی قابل یقین وجہ بھی موجود تھی۔ کہ سائل اور ان کی حکومت نے اسی طرح مندرجہ ذیل محکمے بھی فروخت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ (غیر ملکی سرمایہ کاروں کو) یعنی واپڈا۔ ریلوے۔ PNSC اور بندرگاہیں۔ جس کے ذریعہ سے پاکستان کے اہم حصوں/معاملات میں مداخلت کی راہ ہموار کی گئی۔ اور خاص یونٹوں کو اور عوام کو خطرہ میں ڈالا گیا اور ان کا راز فاش کیا گیا اور ان کو غیر ملکی کمپنیوں کے کنٹرول میں ڈالنے کا خطرہ مول لیا گیا۔ مرکزی حکومت آئین/قانون کے تحت مجاز نہ تھی کہ مندرجہ بالا طریقہ سے فروخت کریں۔

46-مدعی علیہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ سائل اور اس کے نامزدگان نے کئی اہم فیصلے کئے جس کے ذریعے انہوں نے آئین اور بزنس رولز کی خلاف ورزی کی ہے واپڈا PTC ریلوے کا کچھ حصہ اور دیگر ادارے (گورنمنٹ کی ملکیتی) PIA اور قومیائے گئے بنک (خواہ فروخت ہو چکے یا زیر غور فروخت) کی

مجوزہ نج کاری کے امر کو سہائل نے CCI اور NEC کے سامنے نہ رکھا۔ مندرجہ بالا امور سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نج کاری کی پالیسی کے بارے میں CCI اور NEC سے متعلقہ آئینی ضروریات کو پورا نہ کیا گیا اور صوبوں کو موقع نہ دیا گیا کہ ایسی پالیسیوں کے بنانے میں حصہ لے سکیں۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت میں رشوت ستانی اور خویش پروری کی وجوہ کی بنا پر صدر صاحب کے پاس کافی مواد تھا جس کو عدالت میں پیش کیا گیا ہے۔

(بطور Annx A to A-12 $ B)

جن پر (اسمبلی توڑنے کی وجوہ کی مدد میں) غور و خوص کیا گیا۔

47- وجوہ نمبر (e) (جو کہ اسمبلی توڑ حکم میں ہے) یہ ہے کہ کارندوں اور وزیر اعظم کی حکومت کے کنٹرول میں اداروں نے (گورنمنٹ کے مخالفین بشمول سیاسی اور ذاتی رقیب اور رشتہ دار وغیرہ کے لئے) افراتفری۔ ابتری اور پریشانی کا دروازہ کھول دیا تھا۔ درخواست میں لکھا ہے کہ الزام کی مدد میں کوئی ٹھوس حقائق نہ پیش کئے گئے۔ جواب منجانب مدعی علیہم میں لکھا ہے کہ کچھ دستاویزات (اطلاع مہیا کی جارہی ہے اور مزید دستاویزات بعد میں پیش کئے جائیں گے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ جواب درخواست کے ہمراہ کوئی اضافی کاغذ (Annexure) نہیں لگائے گئے۔ جواب الجواب میں الزام کا انکار ہے۔ اور ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی خاص مثالیں نہیں دی گئیں اور اسمبلی توڑ حکم کی وجوہ کی مدد میں کوئی کاغذ نہیں دیا گیا۔ اس لئے یہ وجہ ناکام رہی ہے۔

48- اسمبلی توڑ حکم میں اگلی وجہ وجہ نمبر F ہے۔ جو کہ آگے مزید 5 حصوں میں ہے۔ (i) F یہ ہے کہ کابینہ کو اعتماد میں نہ لیا گیا اور نہ ہی بہت سے آرڈیننس

اور پالیسی امور پر فیصلہ کیا گیا درخواست میں لکھا ہے کہ اسمبلی توڑ حکم کی وجہ نمبر F کے پہلے دو حصے کابینہ کے اندرونی نظم کی طرف حوالہ دیتے ہیں۔ تحتی وجوہات نمبر 3-4 اور 5 بے معنی / مہمل ہیں اور کوئی خصوصی حقائق نہیں دیئے گئے۔ قوانین سروس زیر آئین تقریباً 20 سال سے موجود ہیں اور پبلک سروس کمیشن بھی موجود ہے۔ مدعی علیہم کا دعویٰ ہے کہ قانون سازی اور پالیسی امور میں کابینہ کو اعتماد میں نہ لیا گیا اور بہت سے ''ڈرافٹ آرڈیننس'' کابینہ کے سامنے برائے منظوری نہ رکھے گئے۔ مسٹر حامد ناصر چٹھہ نے یہ شکایت عام بیان میں کی۔ جو کہ لف کی گئی۔ ان کا بڑا رنج یہ تھا کہ کابینہ میں 48 وزرا موجود تھے۔ پھر بھی فیصلے کچن کابینہ نے کئے۔ جس میں صرف 5 آدمی شامل تھے۔ (جن میں سائل بھی تھے) اور دیگر وزراء کو نظر انداز کیا گیا۔ جواب دعویٰ کے جواب میں الزام سے انکار کو دہرایا گیا اور کہا گیا کہ سب فیصلے کابینہ نے کئے ہیں (بشمول آرڈیننس اور پالیسی امور) اس امر کے ذیل میں کوئی ثبوت نہ پیش کیا گیا۔ جس سے پتہ چلے کہ آرڈیننس اور دیگر پالیسی امور کو پوری کابینہ نے منظور کیا۔ ان حالات میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر حامد ناصر چٹھہ صاحب کے بیان میں وزن ہے (جو کہ اس وقت کابینہ کے ممبر تھے) اگر انہوں نے کابینہ کے اجلاسوں میں شرکت کی ہوتی (آرڈیننس اور پالیسی امور کی منظوری میں) تو وہ یہ اعتراض نہ اٹھاتے اور بعد میں مستعفی نہ ہوتے۔

49- یہ وجہ لی گئی ہے کہ سائل / وزیر اعظم نے وفاقی وزرا کو صدر صاحب سے ملنے سے منع کیا تھا۔ درخواست میں اس وجوہ سے متعلق۔ یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ یہ غلط ہے کہ مرکزی وزرا کو کہا گیا ہو کہ وہ صدر صاحب سے نہ

ملیں۔ حالانکہ ایسا کرنا ان کے لئے بالکل ضروری نہ تھا۔ فاضل اٹارنی جنرل نے ہماری توجہ آرٹیکل نمبر 46 کی طرف مبذول کرائی ہے جس کے تحت یہ وزیراعظم کا فرض ہے کہ وہ صدر صاحب کو کابینہ کے جملہ فیصلوں (بابت کارکردگی / نظم امور اور بابت قانون سازی) آگاہ کریں اس حکم کے تحت صدر صاحب ہدایت دے سکتے ہیں کہ وہ معاملہ (جس پر وزیراعظم یا ایک وزیر نے کوئی فیصلہ کر لیا ہو۔ مگر اس پر کابینہ نے غور نہیں کیا) کو بغرض غور و خوص کابینہ کو بھیجا جائے۔ زیر آرٹیکل 48 صدر صاحب کے لئے ضروری ہے کہ وہ کابینہ یا وزیراعظم کی ہدایت پر کام کریں۔ اس آرٹیکل کی کلاز (8) کے تحت یہ سوال آیا کہ کوئی (اور اگر ایسا ہے تو کیا) ہدایت کابینہ نے وزیراعظم نے ایک وزیر نے یا ایک سٹیٹ منسٹر نے صدر صاحب کو دی ہو۔ کے متعلق کسی قسم کی عدالت میں تفتیش نہ کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی عدالت تفتیش کرے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صدر صاحب (زیر آئین) وزرا سے مل سکتے ہیں۔

50- وجہ نمبر (ii) اس الزام کو کور کرتی ہے کہ سیاسی اور ذاتی مفاد کے لئے مرکزی حکومت کے ذرائع اور ادارے بشمول کارپوریشن۔ اتھارٹیاں اور بنکوں کو غلط استعمال کیا گیا۔ کوئی خاص مثالیں جواب میں پیش نہیں کی گئیں۔ اسی طرح وجہ نمبر (iv) میں بھی فضول الزامات (بابت ضیاع رقم کثیر وغیرہ) لگائے گئے ہیں جس کا سارا دباؤ قومی خزانہ پر پڑا مگر کوئی خاص مثالیں نہیں دی گئیں۔ الزامات بے بنیاد ہیں اور ان کی مدد میں کوئی ثبوت نہیں دئے گئے۔ وجہ نمبر (v) F یہ ہے کہ سول سروسز سے متعلق آرٹیکل 240 اور 242 کا پاس نہیں رکھا گیا۔ مگر اس کو صحیح ثابت کرنے کے لئے بھی کوئی ثبوت نہ دیا گیا۔

51-اسمبلی توڑ حکم میں وجہ نمبر (g) یہ ہے کہ بیگم نزہت آصف نواز صاحبہ نے بہت بڑے الزامات لگائے (کہ ان کے شوہر کے ساتھ بہت برا سلوک کیا گیا ہے) اور مزید الزامات لگائے کہ پھر ایسے حالات پیدا ہو گئے جن میں ان کے شوہر وفات پا گئے جس سے ظاہر ہوا کہ مرکزی حکومت کے سب سے بڑے کارندے فوج کے اختیارات کو خراب کر رہے ہیں۔ اور حکومت کی مشینری کو بھی اور خود آئین کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔ درخواست میں ایسے الزام کو غلط کہا گیا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ بیگم نزہت آصف نواز نے ایک اخباری بیان (بغیر پرچہ درج کرائے) دیا۔ الزام کے متعلق علم ہونے پر مرکزی حکومت نے فوراً ایک بہت بڑی کمیٹی بنائی جس میں سپریم کورٹ کے تین جج صاحبان بھی تھے۔ تاکہ معاملہ پر غور کریں۔ اور یہ ایسی گذارش دفتر صدر سے وصول ہونے سے قبل ہی کر دیا گیا۔ جواب میں یہ لکھا ہے کہ صدر صاحب کے کہنے پر انکوائری کمیشن بنائی گئی۔ وزیر اعظم کے سیکٹریٹ میں صدر صاحب کی چھٹی کی نقل 5-30 بجے شام میں پہنچی (نہ کہ 10 بجے رات) جیسا کہ سائل نے دعویٰ کیا ہے۔ رسید کی نقل عدالت میں پیش کی گئی۔ اس مسئلہ پر مزید کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ کیونکہ یہ مسلمہ امر ہے کہ انکوائری کمشن نے گورنمنٹ کو رپورٹ بھیجی ہے۔ فاضل اٹارنی جنرل نے کہا کہ ایسے اہم مسئلہ پر وزیر اعظم نے کوئی کارروائی نہ کی اور صدر صاحب کی مداخلت پر انکوائری کمشن بنائی گئی۔

52-اسمبلی توڑ حکم میں آخر وجہ وجہ نمبر (h) ہے۔ جو اس بارے میں ہے کہ مرکزی حکومت اس قابل نہ رہی کہ صحیح طرح سے ملک میں درپیش مسائل کو حل کر سکے۔ (مسائل بابت ملکی حفاظت و سالمیت اور اقتصادی صورت حال)

اور جس سے یہ ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ ملک میں دوبارہ انتخابات کرائے جائیں۔ اس وجوہ کا درخواست میں انکار کیا گیا ہے۔ یعنی کہ کہا گیا ہے کہ ملک کو اقتصادی مسائل کا کوئی سامنا نہیں۔ اس کے بر عکس (انحصار کے لئے) نگران کابینہ میں فنانس منسٹر کے بیان کا حوالہ دیا گیا۔ جنہوں نے عام بیان دیا کہ مسائل کی حکومت کو سدھارنا جاری رکھا جائیگا۔ یہ لکھنا ضروری ہے کہ نگران کابینہ میں وزیر خارجہ (بمعہ سیکرٹری خارجہ) عدالت کے مطالعہ کے لئے کچھ پوشیدہ کاغذات لائے۔ دونوں طرف کے فاضل وکلا کی موجودگی میں کیمرہ پر کارروائی ہوئی۔ وہ کاغذات خاص کاغذات تھے اور میں ان کے متعلق کچھ نہ کہنا چاہوں گا۔ اس وقت جو صرف میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایسی خطاؤں سے جو کہ مرکزی حکومت سے سرزد ہوئیں ہمارے اور ہمسایہ ملک کے درمیان تعلقات خراب کر سکتیں تھیں۔

54- طارق رحیم کے کیس میں مس بے نظیر بھٹو کی حکومت کو ختم کر دیا گیا اور قومی اسمبلی کو زیر آرٹیکل (b)(2) 58 توڑ دیا گیا۔ جس کے متعلق تفصیل پتہ کرنے کے لئے تہہ تک پہنچنا پڑا اور آخری پیرایہ ہے۔ یعنی کہ :-

"یہ آئینی اختیار اس کا دائرہ احد۔ ماضی میں اس کا مطلب اور پاکستان سے باہر ہمعصر فیصلے کے پس منظر کے لئے بہت ہے۔

حاجی محمد سیف اللہ خان کے کیس میں۔ ہمارے آئین کو باغور پڑھا گیا۔ اور اس کے معانی وغیرہ کو اچھی طرح سے بیان کیا گیا اور سمجھا گیا۔ جب حقیقت میں یا امکانی طور پر آئینی مشینری خراب ہو جائے تو یہ ایک بہت بڑا اختیار ہوتا ہے جس کو استعمال کرنا ہوتا ہے۔ ایسا اختیار استعمال کرنے کے لئے

اس وقت موقع آسکتا ہے جبکہ آئین کے بہت سارے احکامات کو پورا کرنے میں سخت اور لگاتار ناکامی ہو جائے اور یہ سمجھا جانا لگ جائے کہ ملک آئین کے مطابق نہیں چل رہا بلکہ اس سے ہٹ کر چل رہا ہے"

55-اس رپورٹ شدہ کیس میں کل 5 وجوہات درج تھیں (اسمبلی توڑ حکم کی مدد میں) پہلی وجوہ یہ تھی کہ قومی اسمبلی (بطور نمائندہ ادارہ) کے کام کرنے اور اس کی اہمیت وغیرہ کو دھچکا پہنچا ہے (اندرونی خلفشاریوں وغیرہ سے اور سودے بازی سے اور قومی اسمبلی کے قانون بنانے والے امور کو صحیح طرح سر انجام نہ دینے سے) دھچکا پہنچا ہے۔ سودے بازی کے بڑے الزام کے بارے میں پہلے ہی فیصلہ کے مندرجہ بالا پیروں میں تبصرہ کیا چکا ہے۔ (جس کو مانا گیا باوجود اس کے کہ متعلقہ قانون کے تحت کوئی جرم نہ بن سکا۔ لیکن اس کو اخلاقی بنیاد پر مانا گیا۔ اس کے وجود سے قطع نظر کرتے ہوئے جو کہ اپوزیشن نے حکومت کے خلاف کی۔ جو وجوہات اس عدالت نے اس کیس میں خرابی کے بارے میں دی ہیں بہت سے استعفے آجانے کے طریقہ سے اختیار کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس طرح نہ کیا گیا بہر حال اس وجوہ کو اسمبلی توڑنے کے حق میں لیا گیا۔ کیونکہ صدر صاحب نے اس ضمن میں ثبوت دیئے۔

56- طارق رحیم کے رپورٹ شدہ کیس میں دوسری وجہ یہ تھی کہ کامن انٹرسٹ کونسل اور نیشنل فنانس کمشن کے اجلاس طلب نہ کئے گئے۔ اور اس سلسلہ میں عدالت نے اپنے فیصلہ میں یہ نقل کیا کہ ریکارڈ پر کافی خط و کتابت موجود تھی۔ کہ صوبوں نے پر زور گذارش کی کہ ان آئینی اداروں کے اجلاس بلائے جائیں اور بجائے اس کے کہ صدر صاحب غور کرتے کوئی اس امر پر غور

نہ کیا گیا اور آئینی فرائض پورے نہ کئے گئے۔ موجودہ کیس میں ریکارڈ پر بہت سارا مواد موجود ہے (اسی قسم کے الزام کی امداد میں) اس طرح کہ نج کاری کی پالیسی کو مرکزی حکومت نے (بغیر کامن انسٹرسٹ کونسل کے اجلاس میں پالیسیاں بنائے) اپنے ہاتھ میں لیا ہے اور اس طرح صوبے اس میں حصہ لینے سے اور اپنی آواز اٹھانے سے محروم ہو گئے ہیں۔ مگر اس وجوہ کی بنا پر مواد / ثبوت کو رد کر دیا گیا ہے۔ حتی کہ صوبوں کی ان درخواستوں کو جو کہ کارروائی میں شمولیت کے لئے دی گئیں ان کو بھی نامنظور کر دیا گیا۔

57- طارق رحیم کیس میں (مرکزی حکومت میں) رشوت ستانی اور خویش پروری کی اور اختیارات کے غلط استعمال۔ ذرائع سرکاری اداروں (بشمول کارپوریشن بینک اور پاکستان سول سروسز سے متعلق) وجوہات کو ناکافی قرار دیا گیا جس کے بنا پر اسمبلی توڑی جا سکے۔ مگر وجوہات بابت سودا بازی اور کامن انسٹرسٹ کونسل اور نیشنل فنانس کمشن کو کام کرنے کی اجازت نہ دینے والی وجوہات کو ملا کر یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ وجوہات اسمبلی توڑنے کے لئے کافی ہیں۔ طارق رحیم کیس میں پانچ وجوہات کے مقابلہ میں اس کیس میں آٹھ وجوہات ہیں۔ اور ان کی مدد میں کافی مواد / ثبوت لائے گئے۔ جس میں وزیراعظم کی 17-4-93 کی ٹی وی پر تقریر بھی شامل ہے۔ جس تقریر میں صدر صاحب کی مخالفت اور تعطل تعلقات تسلیم کئے گئے ہیں۔ جس کے تحت صدر صاحب پر الزام ہے کہ انہوں نے ملک کو کمزور کرنے والوں کی مدد کی۔

58- میری رائے میں جب آئینی درخواست اس عدالت میں براہ راست وصول کی گئی (بغیر سماعت ہائی کورٹ) اور چونکہ اس عدالت کے بعد اپیل کے

لئے کوئی اور عدالت نہ ہے۔ تو یہ اس عدالت کا فرض اول تھا کہ وہ اس مواد پر خوب غور کرتی جو کہ اسمبلی توڑنے والی وجوہات کی مدد میں پیش کیا گیا۔ اور ان خطوط پر چلتی جو کہ حاجی سیف اللہ خان اور خواجہ احمد طارق رحیم کے کیس میں تھے۔ جس کا فیصلہ اس عدالت نے اس سے قبل کیا تھا۔

59- حاجی سیف اللہ خان کے کیس میں' اسمبلی توڑ حکم کو غلط کیا گیا اور پھر بھی اپیل کی اہمیت دی گئی۔ اس کیس میں یہ طے پایا کہ اسمبلی توڑنے کا حق عوام کو اپیل کرنے کا حق ہے اور سب آئینی اجلاس کا مقصد قانونی اور سیاسی شخصیتوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ جمہوری نظام میں نمائندوں (قومی اسمبلی) کو ختم کرنے کو ہمیشہ پارلیمانی نظام حکومت میں اسی طرح کیا گیا ہے کہ قانونی ہیڈ کی طرف سے سیاسی ہیڈ کو اپیل کی جائے۔ اور بالاخر یہ سیاسی ہیڈ کا حکم ہو گا جس کے تحت یہ تصفیہ کیا جائے گا کہ کابینہ کے حقوق اور اختیارات کیا ہیں۔ جو کچھ بھی مندرجہ بالا کہا گیا یہ سب اس عدالت کے نظریات / فیصلے ہیں جو کہ آرٹیکل 58 (2)(b) کی تشریح وترجمہ کے سلسلہ میں ہیں۔

60- میری رائے میں آرٹیکل 58 (2)(b) آئین میں رہنے کے لئے آئی ہے خواہ وہ پسند کی جائے یا ناپسند کی جائے۔ دو ملکوں کے آئین ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ کیونکہ ہر ملک کا آئین اس ملک کے حالات اور تاریخی اور تہذیبی پس منظر اور وہاں کی رسوم ورواج اور مذہب کے پیش نظر بنایا جاتا ہے اگر یہ (مندرجہ) آرٹیکل وجود میں آئی ہے اور کسی ضرورت کے تحت یہ آئین کا حصہ بن گئی ہے اور اب اس کو نہ قبول کیا جائے تو اس کو مقرر شدہ طریقہ کے تحت ختم کیا جاسکتا ہے یا ترمیم کی جاسکتی ہے۔ یہ فرض قانون سازوں کا ہے کہ قانون

بنائیں اور عدالت کا کام ہے کہ قانون کا ترجمہ / تشریح کرے۔ عدالت ایسا نہیں کر سکتی اور نہ ہی کرنا چاہئے کہ وہ قانون سازی کے امر کو کرے۔ بلکہ عدالت کو اپنی ڈیوٹی صرف اس حد تک رکھنی چاہئے کہ وہ اپنے اصل کام (تشریح وترجمہ آئین / قانون) تک محدود رہے۔ آئین کی تشریح / ترجمہ کرتے ہوئے یہ عدالت کا کام ہے کہ دیکھے کہ تشریح / ترجمہ اس طرح ہو کہ آئین کو آئندہ بھی ٹھیک طور پر چلایا جا سکے۔ آئین کی تشریح وترجمہ عدالت اس تنگ نظری سے نہیں کر سکتی کہ آئین کا کوئی حکم بے معنی اور بیکار ثابت ہو۔

61- موجودہ کیس میں اسمبلی توڑ وجوہات کی مدد میں آیا گیا مواد کو نامنظور کر کے۔ آرٹیکل (b)(2) 58 کی تشریح / ترجمہ کرتے ہوئے عدالت نے تنگ نظری سے اس کی گنجائش / دائرہ کو تقریباً صفر تک کر دیا ہے۔ جس کے تحت یہ اخذ ہوتا ہے کہ کوئی صدر بھی قومی اسمبلی کو نہیں توڑ سکے گا اور کوئی صدر بھی وزیراعظم کی حکومت کو ختم نہ کر سکے گا۔ (باوجود اس کے کہ اس کے پاس کافی مواد موجود ہے کیونکہ عدالت کی اس مواد سے تسلی نہیں ہوئی۔ دوسرے لفظوں میں مندرجہ آرٹیکل کو تقریباً کالعدم / بیکار کر دیا گیا ہے (جو کام صرف قانون ساز ہی کر سکتے ہیں)

62- میرے پاس کوئی وجہ نہیں کہ میں ان خطوط سے ہٹ جاؤں جو کہ حاجی سیف اللہ اور خواجہ احمد طارق رحیم کے کیس میں ہیں (تاکہ اسمبلی توڑ وجوہات کی مدد میں آئے ہوئے مواد پر غور کروں) میرے خیال میں طارق رحیم کیس اور موجودہ کیس میں اس سلسلہ میں آئے ہوئے مواد میں کوئی فرق نہیں۔ اکثریت جج مینٹ میں موجودہ وجوہات صرف تب قابل قبول نہیں جب کہ حتمی

طور پر یہ کہا جائے کہ خواجہ احمد طارق رحیم کیس کا فیصلہ غلط ہوا تھا۔

63- جہاں تک قانونی پہلو کا تعلق ہے تو اس بارے میں کوئی تنازعہ نہیں کہ عدالت اسمبلی توڑنے کی وجوہات اور اس کی مدد میں آئے مواد کا جائزہ لے سکتی ہے تاکہ دیکھے آیا کہ اس کا کوئی خاص تعلق صدر صاحب کی تسلی سے ہے۔ اسی طرح S.R. Bommai وغیرہ کے کیس میں ہو چکا ہے۔ رپورٹ شدہ کیس میں۔ زیر آرٹیکل 356 (انڈین آئین) صدر اعلان کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ گورنر کی رپورٹ (کہ ایک ایسی صورت پیدا ہو گئی ہے جب حکومت کو آئین کے تحت نہیں چلایا جا سکتا) سے مطمئن ہو۔

64- مسز ساجدہ بیگم کے کیس میں یہ ہوا کہ عدالت کو حق ہے کہ وہ (زیر آرٹیکل 356) صدر کی تسلی کے متعلق معلوم کرے اور ایسی تسلی کا دارومدار گورنر کی رپورٹ سے علاوہ مواد پر ہو گا۔ اے کے رائے کے کیس میں یہ ہوا کہ صدر صاحب کی تسلی (جس کا انڈین آئین کی آرٹیکل 123/356 میں ذکر ہے) غیر انصافی تھی اور یہ کہ آئین کی ترمیم نمبر 44 کے پیش نظر وہ کوئی اچھا قانون نہ رہا۔

65- کیپٹن کنول جیت سنگھ کے کیس میں گورنر کی حقائق پر مبنی رپورٹ پر (جس میں یہ لکھا تھا کہ پنجاب میں آئینی حکومت ناکام ہو گئی ہے) صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ اور یہ ہوا کہ گورنر کی رپورٹ کو مجموعی طور پر پڑھا جائے اور ایسا پڑھنے سے یہ ظاہر ہوا کہ صدر کی تسلی نہ تو غلط تھی نہ ہی کسی مفاد کے لئے In-dian Jurisdiction کے Case-Law کے پیش نظر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انڈین آئین میں صدر کی تسلی قابل انصاف بنائی گئی ہے۔ مگر یہ احکامات

آئین کی آرٹیکل (b)(2) 58 سے قدرے مختلف ہیں۔ جو کہ صدر کو وسیع دائرہ اختیار دیتی ہے۔ بہر حال زیر آرٹیکل (b)(2) 58 دائرہ اختیار کا عدالت نے تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔

66- سرکار بنام ضیاء الرحمٰن کے کیس میں مختلف Organs کے درمیان۔ سہ فریقی اختیار کا سوال زیر غور آیا۔ اور یہ ہوا کہ سپریم کورٹ نے اپنے آپ کو آئین سے بالا کبھی نہیں سمجھا نہ ہی اس کو کوئی حق ہے کہ آئین کے کسی حکم کو ختم کر سکے۔ اس نے یہ مانا ہے کہ وہ آئین کی ایک پیداوار ہے۔ اور آئین سے اس کو اختیار ملت اہے۔ اور یہ کہ وہ اپنے آپ کو آئین کے تابع رکھے گی۔ جس کی حفاظت وغیرہ کا اس نے حلف اٹھا رکھا ہے۔ لیکن وہ یہ دعویٰ ہمیشہ کرتی ہے (سپریم کورٹ) کہ اس کو آئین کی تشریح وترجمہ کا حق ہے اور یہ کہ وہ کہہ سکتی ہے کہ کون سے حکم کا کیا معنی ہے یا کیا نہیں ہے (اس سے قطع نظر کہ خواہ وہ حکم سپریم کورٹ کے اختیار کو ختم کرنے کا خاص حکم ہو)

67- فوجی فاؤنڈیشن کے کیس میں یہ ہوا کہ پاکستان کے آئینی سسٹم میں (گو یہاں سہ فریقی اختیارات ہیں پھر بھی اس کا ہر Organ یا برانچ مقرر شدہ میدان میں اس طرح خاص حدود تک کام کرتا ہے۔ کہ ایک Organ (شعبہ) یا ذیلی شعبہ دوسرے کے جائز میدان پر قبضہ نہ کرے (دخل نہ دے)۔

68- دیپال کمار شرما کیس میں یہ ہوا کہ اگر قانون کی زبان پر دو-Construc tion ممکن ہوں تو کورٹ کو چاہئے کہ وہ ان میں سے ایک کو چنے جو کہ مطابقت رکھتی ہو اور بہتر ہو اور دوسری کو اختیار نہ کرے جو اس کو ناحق ناقابل عمل بنا

دے۔ یا نامناسب کر دے یا جس سے عجیب سے نتائج حاصل ہوں یا ایسا عنصر پیدا کر دے جس سے حیران کن غیر یقینی اور عملی طور پر مشکل پیدا ہو (قانون کے چلنے میں)

69- میری رائے ہے کہ مذکورہ Case-Law کے مدنظر اس عدالت (ملک کی عدالت عظمیٰ) کو قانونی حدود کے اندر رہ کر کام کرنا چاہئے۔ خاص کر اس وقت جبکہ آئین اور قانون کی تشریح و ترجمہ کا عمل ہو رہا ہو۔ یہ عدالت تشریح/ترجمہ تو کر سکتی ہے مگر قانون کو بنا نہیں سکتی۔ اور تشریح کرتے وقت دائرہ/اختیار کو تنگ کر سکتی ہے۔ مگر اتنا زیادہ نہیں کہ زیر غور (زیر تشریح) حکم بیکار/کالعدم ہو کر رہ جائے جہاں تک آرٹیکل (b)(2) 58 کا تعلق ہے اس کا پہلے ہی بہتر طور پر ترجمہ و تشریح ہو چکی ہے۔ (حاجی سیف اللہ اور خواجہ احمد طارق رحیم کے کیس میں) جیسا کہ اوپر مذکور ہے اس آرٹیکل کے تحت صدر صاحب اپنے اختیارات استعمال کر سکتے ہیں مگر اس وقت جب حقیقت میں آئینی مشینری میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے اور ایک سے بہت زیادہ احکامات آئین ناکام ہو چکے ہوں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہو کہ ملک کو غیر آئینی طریقہ سے چلایا جا رہا ہے۔ صدر صاحب کو چاہئے کہ وہ پیش نظر مواد کی بنیاد پر اپنی رائے قائم کریں۔ گیارہ ججوں کے فل بنچ میں سے (جنہوں نے اس کیس کی سماعت کی) سات جج وہ ہیں جنہوں نے پہلے کیس (احمد طارق رحیم کیس) میں 12 ججوں پر مشتمل فل بنچ میں سماعت کی۔ ان سات ججوں میں سے 6 نے صدر صاحب کے اسمبلی توڑ حکم کو برقرار رکھا (وہ حکم جس کے ذریعہ سے انہوں نے مس بے نظیر بھٹو (وزیر اعظم) کی حکومت کو ختم کیا۔ اور قومی اسمبلی توڑی موجودہ بنچ کے 3

مزید ججوں نے حکم (بابت ختم کرنے حکومت اور بابت اسمبلی توڑنے) ہائی کورٹس میں آئینی درخواستوں کی سماعت کے دوران بر قرار رکھا۔ پس 11 ججوں کے موجودہ بنچ میں سے جنہوں نے اسمبلی توڑ حکم بابت کیس طارق رحیم بر قرار رکھا۔ اب یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ موجودہ کیس میں اسمبلی توڑ وجوہات کے ذیل میں آیا ہوا مواد ناکافی ہے اور اسمبلی توڑ حکم بغیر قانونی اختیار کے ہے اور اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔

70- میں معذرت سے کہتا ہوں کہ میں اکثریت رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔ میری رائے ہے کہ آرٹیکل (2) 17 سیاسی جماعت کو یہ بنیادی حق نہیں دیتی کہ وہ اپنی معیاد پوری کرے۔ میری رائے اس سے بھی ہٹ کر ہے کہ اسمبلی توڑ حکم میں آئین کی پسپائی کا ذکر کرنے سے وزیر اعظم کے بنیادی حق (زیر آرٹیکل 14) کی خلاف ورزی کی گئی ہے نہ ہی کوئی حق مجانبیت ہے کہ کیا جائے کہ صدر صاحب وزیر اعظم صاحب کو روک رہے تھے کہ وہ مرکز کے Under میں Tribal areas کو Executive مرکزی حکومت کی سیاسی سرگرمی سے نہ نوازیں۔

71- بہر حال میں افسوس سے کہتا ہوں کہ میں ان وجوہات سے اتفاق نہیں کرتا کہ میں اب پہلا نقطہ نظر چھوڑ کر اب کوئی نئی رائے قائم کروں یعنی کہ اپنی رائے بابت کیس احمد طارق رحیم سے ہٹ جاؤں (جبکہ دونوں کیسوں میں الزامات کم و بیش وہی ہیں) اور مواد زیر امداد اسمبلی توڑ حکم پہلے کی نسبت اس کیس میں زیادہ ہے۔ ایک خصوصی پہلو (اس کیس میں) یہ ہے کہ وزیر اعظم نے ٹی وی پر قوم کو خطاب کیا جس میں صدر صاحب پر کھلی تنقید کی گئی اور ان کی

ممانعت ظاہر کی اور ایسی صورت پیدا ہو گئی کہ جس میں مرکزی حکومت آئین کے تحت نہیں چلائی جا سکتی اور جس سے انتخاب کندگان کو اپیل کرنا ضروری ہو گئی۔ یہ مسئلہ سیاسی ہیڈ کو فیصلہ کے لئے سونپا جا سکتا تھا میری یہ بھی رائے ہے کہ آرٹیکل (b)(2) 58 ایک خود مختار حکم ہے جس کے تحت صدر کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اسمبلی توڑ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ یہ پورا سمجھیں کہ اب ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گئی جس میں مرکزی حکومت کو اب آئین کے تحت نہیں چلایا جا سکتا۔ اور انتخاب کنندگان کو اپیل کرنا ضروری ہو گیا ہے صدر صاحب کی رائے کو عدالت نہیں بدل سکتی۔ اگر وہ ایسی رائے رکھتے ہیں اور اسمبلی توڑ وجوہات کی مدد میں ان کے پاس کافی مواد / ثبوت موجود ہے (ایسی رائے قائم کرتے وقت) تو پھر عدالت کو چاہئے کہ وہ ایسا حکم دے اور سیاسی Head آخری فیصلہ دے۔

72- یہ مسلمہ ہے کہ حاجی سیف اللہ کے کیس میں گو اسمبلی توڑ حکم کو نادرست پایا گیا۔ مگر قومی اسمبلی اور حکومت کی بحالی کی اس وجہ سے اجازت نہ دی گئی کیونکہ انتظامی مشینری انتخابات کے لئے پوری حرکت میں ہے جو کہ سب سیاسی جماعتوں کو حصہ لینے کا موقع دے سکتی تھی (کہ پہلے انتخابات Non- Party کی بنیاد پر ہوئے تھے۔ ایک اور وجہ یہ تھی کہ دائرہ اختیار رٹ-Discretion ary تھا جس کا جائز طور پر انکار کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ بہت بڑا نقصان ہو سکتا تھا اگر Relief دے دیا جاتا اور قومی مفاد کو انفرادی حق پر ترجیح/اولیت دی جاتی۔ طارق رحیم کیس میں مس بے نظیر بھٹو کی مرکزی حکومت کو ختم کر دیا گیا اور قومی اسمبلی توڑ دی گئی۔ اسمبلی توڑ وجوہات کے سہارے میں مواد موجود تھا اور

اس کو اسمبلی توڑنے کے لئے کافی سمجھا گیا۔ اس کیس میں طارق رحیم کے کیس کے خطوط سے مکمل کج روی ہے۔ جہاں تک اسمبلی توڑنے کی وجوہات کے سہارے میں مواد کی موجودگی اور غور و خوص کا تعلق ہے (گو اس کیس میں مزید وجوہات بھی ہیں جیسا کہ اسمبلی توڑ حکم میں لکھا ہے جس کے متعلق کافی مواد آیا ہے۔ مگر اس کو (میرے خیال میں) ناکافی ہونے کی وجہ سے نامنظور کیا گیا ہے۔

73- ہو سکتا ہے میں غلطی پر ہوں اور امور کو غیر ضروری طور پر سوچ رہا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ میں غلطی پر ہوں مگر جو مجھے نظر آتا ہے کہ خواجہ احمد طارق رحیم کے اور اس کیس میں کوئی فرق نہیں (جہاں تک الزامات اور اسمبلی توڑ وجوہات اور اس کے سہارے میں آئے ہوئے مواد کا تعلق ہے) اس کیس میں غلطی کی گئی ہے اور مواد کو پرکھنے کا وہی پیمانہ نہیں استعمال کی گیا تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سندھ کے دو وزرا آرٹیکل (b)(2) 58 کی وجہ سے قربان کر دیئے گئے۔ لیکن جب پنجاب سے وزیر اعظم کی باری آئی تو معاملہ الٹ گیا۔ غیر متنازعۃ کارروائی کے شروع ہی میں یہ تاثرات/اشارے دیئے گئے کہ عدالت کا فیصلہ ایسا ہو گا جو کہ قوم کو خوش کریگا۔ ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ قوم کو کیا چیز خوش کریگی کیا قانون کے عین مطابق ہو گا یا نہیں۔ میری رائے میں عدالت کا فیصلہ قانون کے عین مطابق ہونا چاہیئے نہ کہ قوم کو خوش کرنے کے لئے ہو سکتا ہے کہ جو چیز قوم کو خوش کرے وہ قانون/آئین کی روح کے منافی ہو۔

74- میری رائے میں ملک میں موجودہ بحران کا حل حکومت و قومی اسمبلی کو بحال کرنا نہیں بلکہ سیاسی چیف کو اپیل ہے (جو کہ ایک آئینی چیز ہے) اسمبلی توڑ

حکم کے پاس ہونے کے وقت مرکزی حکومت کے دونوں ستون اس جگہ پہنچ چکے تھے جہاں سے واپسی کے امکانات نہ تھے اور ان کے درمیان مفاہمت ممکنات میں سے نظر نہیں آتی۔ ایسے حالات میں یہ امید نہیں رکھنی چاہئے کہ ماضی کی تلخیوں کو بھلا دیا جائیگا اور ملکی مفاد میں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر کام کریں گے۔ ایسے حالات میں بحالی اس سے زیادہ نقصان دے ہو گی کہ سیاسی صورت حال مزید بگڑے اور دونوں فریقان کو ہارس ٹریڈنگ کی کھلی چھٹی مل جائے تاکہ صحیح یا غلط طریقہ سے ممبران اسمبلی کی Support حاصل کریں۔ جو کہ یقیناً حکومت کے چلنے میں بہتر نہ ہو گا اور اس سے احکام آئین کے تحت جمہوری ادارے بھی پھل پھول نہ سکیں گے۔ میں نے یہ فیصلہ لکھ دیا ہے تاکہ ریکارڈ سیدھا ہو جائے اور تاکہ بتادوں کہ میری رائے میں یہ Fit کیس ہے جس میں اسی نتیجہ اعلان کیا جانا چاہئے تھا جیسا کہ پہلے (طارق رحیم کے) کیس میں ہوا تھا۔ اس لئے میں اس درخواست کو Dismiss کرتا ہوں۔

گھر کی گواہی

بیگم سجاد علی شاہ : جب سے ہماری شادی ہوئی ہے آج تک کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ ایسی نوبت کبھی نہیں آئی کہ ایک دوسرے کے ساتھ لڑنا پڑے۔ ہمیشہ ایک دوسرے کے جذبات کا خیال رکھا۔ ہمارے نزدیک گھر کی دنیا باہمی پیار اور ایثار کے جزبوں سے قائم رہتی ہے اور سادہ طرز حیات آدمی کو ذہنی اور روحانی طور پر آسودہ حال رکھتی ہے۔

س :-بچوں کی تربیت میں شاہ صاحب کا کوئی رول رہا ہے ؟

بیگم سجاد :-بچوں کی تربیت میں والد کا رول ہوتا ہے لیکن یہ اکثر بسلسلہ ملازمت دیگر شہروں میں رہے اس لئے بچوں کو زیادہ وقت نہ دے سکے۔

س :-شادی کے موقع پر شاہ صاحب نے کیا تحفہ دیا تھا؟

بیگم سجاد :-اس وقت تحفہ دینے کا رواج نہ تھا۔ تحائف لینے دینے کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا ہے۔

جسٹس سجاد : ہمارے دور میں تو نکاح نامہ بھی نہیں ہوتا تھا۔

بیگم سجاد :-انتہائی سادگی سے ہماری شادی ہوئی تھی۔

س :-شادی سے قبل آپ سے پسند یا ناپسند کے بارے میں رائے لی گئی تھی ؟

بیگم سجاد :- رائے کے بغیر تو شادی نہیں ہو سکتی۔ منگنی کے بعد شاہ صاحب انگلینڈ چلے گئے تھے۔ ہم نے صاف ستھری زندگی گزاری ہے۔ شاہ صاحب عظیم انسان ہیں۔ جو شخص سادگی سے زندگی گزارتا ہے' وہ جانتا ہے کہ زندگی کیسے گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو ہمیشہ اطمینان قلب عطا کرتا ہے جو نمود و نمائش کے لئے جان نہیں دیتے۔

س :- آپ نے کبھی کوئی خواہش کی.....

بیگم سجاد :- کبھی نہیں' سب خواہشیں خود بخود پوری ہوتی رہیں۔ بندہ جب اپنے معاملات اللہ پر چھوڑ دیتا ہے تو اللہ بھی اس کی مدد کرتا ہے شاہ صاحب جب وکیل تھے' اس وقت بھی ہماری زندگی سادہ تھی۔ جب جج بنے تو بھی طرز زندگی میں تبدیلی نہ آئی۔ شاہ صاحب حقیقت پسند اور اصول پسند آدمی ہیں اور آپ جانتے ہیں کہ ایسے انسان خود کو ساری زندگی ایک ہی روش پر رکھتے ہیں۔

س :- بچوں کو کتنا وقت دیتے ہیں ؟

بیگم سجاد :- جب بھی گھر آتے تھے تو سارا وقت بچوں کے ساتھ گزارتے تھے۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں' نہ بچوں کو کوئی شکایت رہی ہے۔ ہماری زندگی ہمیشہ ایک دوسرے پر اعتماد اور اعتبار کر کے گزری ہے۔

س :- گھر میں کس کا حکم چلتا ہے ؟

بیگم سجاد :- جو بھی فیصلہ کرنا ہوتا' ہم دونوں مل کے کرتے ہیں بچوں کی شادی کا فیصلہ بھی دونوں نے مل کر کیا۔ میری بڑی بیٹی سیما وکالت کرتی ہے۔ اس نے اپنے ابو کی لائن اختیار کی ہے دعا ہے کہ یہ اپنے والد کی طرح منصفی کے اس باوقار شعبے میں عزم اور استقامت سے رہے۔

س :- زندگی میں اچھا برا وقت آتا رہتا ہے۔ شاہ صاحب نے بڑی ذمہ دار عہدوں پر کام کیا ہے۔ ان عہدوں پر سیاسی دباؤ بھی رہا۔ سیاسی دباؤ کے دوران ان کا رویہ کیسا ہوتا تھا؟

بیگم سجاد :- ہم نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا اور اللہ سے مدد مانگی۔ یہ سارے مسئلے خدا خود حل کرتا ہے۔ اسی کو طاقت حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

س :- شاہ صاحب سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے ہیں۔ کیا رشتہ داروں میں سے یا باہر سے کسی نے آپ کو ان کے سامنے سفارش کا مطالبہ نہیں کیا؟

بیگم سجاد :- اپنے اور بیگانے جانتے ہیں کہ مقدمے کے معاملے میں یہ کسی کی سفارش نہیں مانتے۔ انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ میں صرف اللہ کے حضور جواب دہ ہوں۔ دنیاوی طاقتیں مجھے زیر نہیں کر سکتیں۔ مجھ پر عدل کی اتنی نازک ذمہ داری عائد ہوئی ہے کہ اس میں ذرا سی کوتاہی بھی مجھے میرے منصب کے حقیقی تقاضوں سے دور کر سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تمام زندگی اسی نظریے پر کاربند رہے۔

س :- کیا آپ شادی کی سالگرہ مناتے ہیں؟

بیگم سجاد :- اگر یاد رہے تو منا لیتے ہیں۔

س :- سیما بیٹی آپ اپنے پاپا کے بارے میں بتائیں کہ وہ کیسے ہیں۔ کیا قانون کی تعلیم آپ نے اپنی مرضی سے حاصل کی؟

سیما :- (دختر سجاد علی شاہ) میں نے لاء کی تعلیم شادی کے بعد حاصل کی۔ میرے شوہر انجینئر ہیں۔ بسلسلہ ملازمت وہ کراچی سے باہر رہتے تھے میں گھر میں فارغ بیٹھی رہتی تھی۔ ڈیڈی نے کہا کہ لاء کر لو۔ امتحان کے دوران ڈیڈی

مجھے پڑھاتے تھے۔ امتحان کے دوران اکثر طالب علم کتابیں کھول کر نقل کرتے تھے مگر اللہ کا شکر ہے کہ ڈیڈی کی سرپرستی اور رہنمائی میں' میں نے امتحان کی تیاری اس بھرپور انداز میں کی تھی کہ مجھے کہیں بھی یہ خیال نہیں گزرا کہ میں بھی دوسروں کی طرح کتاب کھول کر نقل کروں۔ آپ اس سے ہرگز یہ مراد نہ لیجئے گا کہ نقل کے لئے عقل کی ضرورت ہوتی ہے (قہقہہ)

عقل تو رب العزت کی عطا کردہ ایسی نعمت ہے جو اس نے ہم جیسے ناچیز بندوں میں بھی کچھ نہ کچھ پیدا کر رکھی ہے

س :- آپ کو زیادہ پیار ڈیڈی سے ہے یا ممی سے ؟

سیما :- پیار دونوں سے ہے نہ نہیں کہہ سکتی کہ کسی سے زیادہ ہے اور کسی سے کم' ممی سے ہم نے صبر سیکھا ہے اور پاپا سے مستقل مزاجی' انہوں ہر دور حکومت میں صبر اور مستقل مزاجی سے کام کیا ہے۔ ان کو سکون بہت کم ملا ہے۔ کوئی نہ کوئی پریشانی رہتی تھی۔ صبر اور قناعت کا جذبہ ان دونوں میں ہے۔

س :- آپ کی تربیت میں زیادہ ہاتھ کس کا ہے ؟

سیما :- ڈیڈی بہت خاموش طبع ہیں۔ ہم نے کبھی ان دونوں کو لڑتے نہیں دیکھا۔ جب ہم سمجھتے ہیں کہ ڈیڈی کا موڈ ٹھیک نہیں تو ہم ان سے بات نہیں کرتے۔ کبھی ماں باپ کو اونچی آواز میں بات کرتے ہوئے نہیں سنا۔ اگر ڈیڈی کا موڈ خراب ہو یا ان کو غصہ آجائے تو یہ بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ گھر میں خاموشی ہو تو ہم سمجھ جاتے ہیں کہ ڈیڈی کا موڈ ٹھیک نہیں۔

س :- کسی بات پر کبھی ڈانٹ بھی پڑی یا نہیں ؟

سیما۔ مجھے کبھی نہیں ڈانٹا۔ سب لوگ مجھے کہتے ہیں کہ تم ڈیڈی کی بہت لاڈلی

ہو۔

بیگم سجاد :- یہ بڑی بیٹی ہے اس لئے اس کو نہیں ڈانٹتے۔

س :- کیا چھوٹوں کے ساتھ بھی یہی رویہ ہے تعلیم یا کسی اور معاملے میں۔

بیگم سجاد :- ہر بچہ اپنے کام میں مشغول ہوتا تھا۔ بچوں نے اپنی مرضی سے تعلیم حاصل کی۔ ہم نے بچوں کی مرضی کو مانا۔

س :- کوئی دلچسپ فقرہ، بات یا شعر جو شاہ صاحب گھر میں پڑھتے یا بولتے ہوں۔

سیما :- ایک مرتبہ ڈیڈی سکھر میں تھے۔ ٹی وی پر علامہ اقبال کا ایک شعر پڑھا گیا۔ ممی نے بھی وہ شعر نوٹ کر لیا۔ اتفاق کی بات کہ وہی شعر ڈیڈی نے بھی نوٹ کرر کھا تھا۔ ڈیڈی نے وہ شعر ممی کو سنایا۔ شعر یہ تھا۔

میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

اس سے آپ ممی اور ڈیڈی کی ذہنی ہم آہنگی کا انداز الگا سکتے ہیں۔

س :- جسٹس صاحب آپ کو شاعری کا شوق بچپن سے رہا ہے اور آپ نے "بیدار" تخلص بھی رکھا۔ آپ کو یقیناً کئی شعر یاد ہوں گے۔ کچھ سنانا پسند کریں گے ؟

سجاد علی شاہ :- احمد فراز کا بھی کلام پسند رہا ہے مثلاً ان کے یہ اشعار۔

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

سیما :- جب باہر سے آتے ہیں تو بچوں کے لئے چھوٹی موٹی چیزیں لے آتے ہیں۔ میری بیٹی ان سے بہت زیادہ اٹیچ ہے۔

س :- کیا کبھی فرمائش نہیں کی۔

سیما :- نہیں

س :- کیا یہ بھی علامہ اقبال کی طرح ''غریبی میں نام'' پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

سیما :- (ہنستے ہوئے) ایسی کوئی بات نہیں۔

س :- ملازمت کے دوران چھٹی کا دن کیسے گزارتے تھے ؟

سیما :- سب بچوں کو لے کر ہم باہر چلے جایا کرتے تھے۔ کھانا باہر کھا لیتے تھے ورنہ ڈیڈی واک کیا کرتے تھے۔

س :- بیگم صاحبہ آپ نے اپنی تعلیم کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ؟

ج :- میرے چچا تعلیم کے خلاف تھے اس لئے میں نے آٹھویں اور نویں کلاس کے بعد آگے نہیں پڑھا۔

س :- شادی کے بعد جیسے آپ کی بیٹی نے تعلیم حاصل کی۔ آپ نے تعلیم پر توجہ نہیں دی۔

بیگم سجاد :- جو کمی ہم میں رہ گئی تھی وہ ہم نے اپنے بچوں میں نہیں رہنے دی۔ ان میں پوری کر دے

سجاد علی شاہ :- شادی کے بعد جب تک جوائنٹ فیملی سسٹم تھا تو یہ پردہ کرتی تھیں اس کے بعد الگ رہنے لگے۔ جب والد صاحب کو ملنے جاتے تھے تو یہ گاڑی میں بیٹھ کر برقع پہن لیتی تھی سید فیملی سے تعلق ہے اس لئے پردے کی سختی بہت زیادہ تھی۔ اپنے خاندان میں پہلا شخص ہوں جو لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں ہوں۔

س :- آپ نے لا کی تعلیم شوقیہ حاصل کی ہے یا پریکٹس کرنے کا ارادہ ہے ؟

سیما :- میری رجسٹریشن ہو چکی ہے بچے ابھی چھوٹے ہیں شوہر باہر ہوتے ہیں۔ اگر میں پریکٹس کروں گی تو بچے توجہ سے محروم رہیں گے۔ بچوں کو نوکروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اگر ڈیڈی نے آفس کھولا تو (ہنستے ہوئے) پارٹ ٹائم جاب کر لوں گی۔

سجاد علی شاہ :- ایک بچپن کی بات بتاتا چلوں ہمسایوں کے بچوں کے ساتھ ہمارے تعلقات تھے یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت بارہ برس کا ہوں گا۔ میرے پڑوس ایک لڑکا تھا جس کے خاندان میں حاجیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس نے آل انڈیا ریڈیو پر ایک گانے کی فرمائش لکھ کر بھیجی۔ اس نے خط میں اپنے ساتھ اپنے چچاؤں' ماموں اور دیگر بزرگوں کے اسما لکھ دیئے۔ جب یہ نام ریڈیو پر پکارے گئے تو لوگ حیران ہوئے کہ اتنے حاجی گانے کی فرمائش کر رہے ہیں۔ اس وقت ایسا سخت ماحول ہوا کرتا تھا۔ طالبان کی طرح تو نہیں البتہ ان کے قریب قریب تھا۔ ہمارے والد اور چچا نے خاندان

میں سب سے پہلے تعلیم حاصل کی۔اب تیسری نسل تعلیم پا رہی ہے۔ آہستہ آہستہ آزادی دے رہے ہیں۔البتہ اصولوں میں نرمی نہیں کی۔

سیما :-ڈیڈی کے ایک دوست بیرون ملک مقیم ہیں جب کبھی پاکستان آتے ہیں تو ڈیڈی کی بچپن کی بہت سی باتیں بتاتے ہیں ؟

سجاد علی شاہ :- میری بیٹی نے میرے جس دوست کا ذکر کیا ہے ان کا نام عبدالرزاق شیخ ہے۔ان کا تعلق عبدالحمید شیخ خاندان سے ہے۔ عبدالحمید شیخ کی تحریک پاکستان میں بہت خدمات ہیں۔ انہوں نے ایک الیکشن میں ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو کو شکست دی تھی۔وہ میرے ساتھ زیر تعلیم تھے۔ بہت شریر تھے ہم دونوں بہت شرارتیں کرتے تھے۔ان دنوں امریکا میں مقیم ہیں۔وہاں انہوں نے ایک امریکی خاتون سے شادی کر رکھی ہے۔جب بچپن کی یادیں' ذہن میں تازہ ہوتی ہیں تو میں خیالوں کی دنیا میں چلا جاتا ہوں۔اس وقت کچھ آشنا چہرے باتیں اور شرارتیں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ماضی بھی یادوں کا انمول سرمایہ ہوتا ہے۔

بہت سی باتیں بھول چکی ہیں۔ میری زندگی میں جتنے بھی بحران آئے۔ مجھے خاندان کے تمام افراد کا بھرپور تعاون حاصل رہا۔ میرے دامادوں کے خلاف حکومت نے انتظامی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔بلیک میل کرنے والے ہمیشہ دکھتی رگ کو پکڑتے ہیں بیٹی کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ سخت سے سخت انسان بھی موم ہو جاتا ہے۔ حکمرانوں نے انہی باتوں سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اللہ کی مہربانی سے میری بیٹیوں اور دامادوں نے میرا ساتھ نبھایا۔ انہوں کہا ہماری تکلیف کی پرواہ نہ کریں اصولوں پر ڈٹے رہیں۔ یہ لوگ ابھی تک

مشکلات برداشت کر رہے ہیں اصول پرستی خاندان کے لئے نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ مجھے مراعات کی خواہش نہیں تھی لیکن میری بیٹی کے گھر پر حملہ کرایا گیا۔ میرے داماد کو بھی تنگ کیا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اب حکومت ان کو دہشت گردی کے الزام میں پکڑنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

بیگم سجاد :- شاہ صاحب کہ حکومت نے زبردستی ریٹائر کیا۔ چھوٹا داماد بھی ابھی تک معطل ہے۔

سجاد علی شاہ :- حالات بہت تلخ ہیں اکثر لوگ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں ہماری طرح سب کے بچے ہیں لوگ بچوں کے لئے مراعات حاصل کر کے حکومت کو سپورٹ کرتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق اپنی پوسٹنگ کراتے ہیں سارے ججز کے جو رشتے دار ہیں ان کو اچھی اچھی پوسٹیں حاصل ہیں۔ لاہور میں دو دو پوسٹنگ ہیں آپ چاہیں تو شہباز شریف سے بات کریں اگر آپ ان سے تعاون کریں تو وہ آپ کی بات سنیں گے، سچ بولنا اور اس پر قائم رہنا بہت مشکل ہے۔

س :- آپ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا آپ نے ڈیڈی سے کمپرومائز کرنے کے لئے نہیں کہا۔

سیما :- ہم نے شروع ہی سے اپنے والد کو اصولوں کی جنگ لڑتے ہوئے دیکھا ہے

سجاد علی شاہ :- میں ماحول اور تربیت پر زور دیتا ہوں سندھ کے دیہی علاقے میں لوگوں کی ضروریات اور خواہشات کم ہیں۔ وہ چاول لسی اور روٹی پر خوش ہیں اگر یہ محدود خوشیاں بھی ان سے چھین لیں تو وہ بغاوت کریں گے۔ اب ایسے حالات ہیں کہ لوگوں کی یہ ضروریات بھی پوری نہیں ہو رہیں۔ افراط زر

کی شرح بڑھ رہی ہے حالات تیزی سے مکمل تباہی کی طرف جارہے ہیں۔ ہمارے ملک میں بی بی ہے یا نواز شریف لوگوں کے پاس کوئی اور چوائس ہی نہیں۔ ذرا سی بات ہو تو بی بی کہتی ہیں اب ان کے بعد الیکشن ہوں گے اور میں اقتدار میں آجاؤں گی۔

سوال :-بے نظیر بھٹو کے ساتھ آپ کے کیا اختلافات تھے؟

سجاد علی شاہ :-وہ بھی ججوں کی سیاسی تقرری چاہتی تھیں میں نے کہا نہیں یہ جج آئین کے ساتھ وفادار ہونے چاہئے اور یہی ان کی اہلیت ہو گی۔ ہم نے اپنے ضمیر کے مطابق ان کا تقرر کیا ہمارے اختلافات کی بنیاد ججوں کا تقرر پر تھا۔ آج کل کراچی میں بھی وہی جھگڑا چل رہا ہے۔ حکومت اپنے بندوں کو خصوصی عدالت کا جج بنانا چاہتی ہے ان عدالتوں میں ایڈیشنل سیشن ججوں کو جانا چاہے تاکہ اگر کوئی شکایت ملے تو چیف جسٹس ان کو ٹرانسفر کر سکے۔ اگر سیاسی تقرریاں ہوئیں تو فیصلے بھی حاکم علی عباسی جیسے ہوں گے اس طرح لوگ حکومت کے خلاف ہو جائیں گے۔ فیڈریشن کا تصور ختم ہو جائے گا لوگوں کے دلوں میں یہ خوف بیٹھ جائے گا کہ کچھ ہونے والا ہے اندرون سندھ میں چلے جائیں وہاں علیحدگی کے جذبات پیدا ہو رہے ہیں۔ جن ایشوز کو ابھی نہیں چھیڑنا چاہئے تھا یہ لوگ ان کو باہر لے آئے ہیں شوشہ چھوڑ کر خاموش ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ اس سے صوبائیت پیدا ہو رہی ہے حکمران طبقہ بے حد سنجیدہ ہونا چاہئے صوبوں کو ساتھ لے کر چلیں تاکہ لوگ خوش ہوں غلط کام اور غلط فیصلے ہو رہے ہیں۔

س :- علی رضا حسین (نواسا) آپ کو نانا ابو کیوں اچھے لگتے ہیں؟

علی رضا حسین :-ویسے ہی بہت اچھے لگتے ہیں۔

س :-نانا ابو ٹی وی پر کس قسم کے پروگرام دیکھتے ہیں ؟

علی رضا حسین :- زیادہ پابندی کے اور تسلسل سے کچھ خاص پروگرام نہیں۔ جب کبھی موقع مل جاتا ہے 'کوئی ڈرامہ یا پھر خبریں سن اور دیکھ لیتے ہیں۔

سجاد علی شاہ :- جب میں خبریں سنتا ہوں تو میری نواسی فروا کہتی تھی۔ نانا کا فیورٹ پروگرام آیا ہے۔

سیما :-ڈیڈی میری بیٹی فروا کے لئے اتنی چیزیں لے کر آتے ہیں کہ کبھی فرمائش کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔

محمد علی (فرزند سجاد علی شاہ)

میں کالج آف بزنس منجمنٹ، کراچی سے بی بی اے کر رہا ہوں۔ اس کے بعد ایم بی اے کر کے سی ایس ایس کرنے کا ارادہ ہے۔

ڈیڈی چیف جسٹس آف پاکستان ریٹائر ہوئے ہیں مگر میرا وکالت کی طرف کوئی رجحان نہیں ہے عدلیہ سے وابستگی کے آخری دنوں میں جب ڈیڈی کی حکومت سے کشیدگی پیدا ہوئی تو وہ بالکل نارمل تھے۔ باپ بیٹے کے درمیان کبھی اس موضوع پر گفتگو نہ ہوئی۔ جو ان کی نظر میں درست تھا، وہ کر رہے تھے۔ ہم کوئی مداخلت نہ کرتے تھے۔

جسٹس سجاد علی شاہ۔ مقتدر شخصیات کی نظر میں

ڈاکٹر خالد رانجھا صدر لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن

جناب سجاد علی شاہ صاحب چیف جسٹس آف پاکستان رہے ہیں۔ بطور چیف جسٹس انہوں نے بھر پور کردار ادا کیا۔ نواز شریف کی حکومت کی کوشش تھی کہ عدلیہ کے اختیارات کم کئے جائیں مگر سجاد علی شاہ صاحب نے ایسا نہ ہونے دیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ فیصل آباد میں نواز شریف نے چار افراد کو گرفتار کیا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ صاحب نے اخبارات میں جب یہ خبر پڑھی تو انہوں نے کہا کہ وزیر اعظم کا یہ کام نہیں کہ وہ جرم ثابت ہوئے بغیر کسی کو گرفتار کریں۔ انہوں نے خود اس کیس کو سنا۔ میں ان دنوں ہائی کورٹ کا جج تھا۔ سجاد علی شاہ صاحب کے اس اقدام سے میں بہت متاثر ہوا۔ انہوں نے ثابت کیا کہ ہر شخص کو اپنے دائرہ میں رہ کر کام کرنا چاہئے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو آئین میں رہ کر اپنا کردار ادا کرنا چاہئے۔ شاہ صاحب آئین کی بالادستی چاہتے تھے جبکہ نواز شریف پارلیمنٹ کی بالادستی کے قائل ہیں۔ اس مسئلے پر ان کا نواز شریف سے اختلاف پیدا ہوا۔ نواز شریف کی خواہش تھی کہ ان کے خلاف جو کیسز ہیں 'ان کی سماعت وہ نہ کریں۔ اگر شاہ صاحب نواز شریف کی بات مان لیتے تو مراعات حاصل کر سکتے تھے۔ انہوں نے مصائب کا سامنا کیا مگر حکومت کی

طرف سے ہر قسم کی مراعات کو ٹھکرا دیا۔

جب میں ہائی کورٹ کا جج تھا تو اپنے گاؤں گیا۔ وہاں چیف جسٹس سجاد علی شاہ صاحب کا تذکرہ شروع ہو گیا۔ تو ایک شخص بولا ''مینوں نہیں پتہ کہ سجاد علی شاہ صاحب دا حکومت نال کیہ پھڈا اے۔ مگر شاہ ہوری ہے مرد نیں'' اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ گاؤں کا ان پڑھ شخص بھی شاہ صاحب کو جرات مند مرد کا خطاب دیتا ہے۔ آپ کو علم ہے کہ کسی شخص کے پاس اختیار نہ ہے تو لوگ اسے پوچھتے نہیں مگر شاہ صاحب کی صورتحال مختلف ہے۔ جب ان کو چیف جسٹس کے منصب سے ہٹا دیا گیا تو عوام نے انہیں پہلے سے زیادہ عزت اور تکریم دی۔ لوگ شاہ صاحب کی عزت دل سے کرتے ہیں۔ آج ان کی جس قدر پذیرائی ہو رہی ہے' اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ورنہ ان سے قبل کتنے چیف جسٹس ریٹائر ہوئے۔ کیا ان کو عوام میں اتنی پذیرائی ملی؟ اب تو وہ کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکتے اس کے باوجود عوام ان کی بے حد عزت کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فیصل آباد بار گئے تو ان کے استقبال کے لئے جلوس چار میل باہر آیا ہوا تھا۔

میں نے ہائی کورٹ بار کا صدارت کا الیکشن لڑا تو ان دنوں جسٹس سجاد علی شاہ خصوصی طور پر لاہور تشریف لائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کا ووٹ بنک ہے مجھے ان کی وجہ سے فائدہ پہنچا۔ میری کامیابی میں ان کا حصہ ہے۔

غلام رسول سندھو ایڈووکیٹ گوجرانوالہ

یوں تو چیف جسٹس آف پاکستان تاریخ اور وقت کے بہتے دھارے کے ہر بھور پر عہدہ جلیلہ پر فائز ہوتے آئے ہیں۔ کسی نے بہتے دریا کے بہاؤ کے سہارے وقت گذارا اور کسی نے گہرائی میں اتر کر سطح آب پر بلبلے چھوڑے اور خود گم ہو گے۔ کسی نے حکمرانوں سے دل لگا کر وقت گذارا۔ کسی نے ملکی سلامتی کے نام پر حکمرانی قانون گلا گھونٹا۔ اور کسی نے بہتی گنگا میں اشنان کیا مگر چیف جسٹس سید سجاد علی شاہ صاحب ایسے چیف جسٹس آئے۔ جنہوں نے قانون کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے عمل سے بڑے سے بڑے آدمی کو قانون کی حکمرانی کا تابع بنانے کے لئے مضبوط اور جرات مندانہ قدم اٹھایا۔ تاریخ میں اسلامی روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کی کہ قانون، کلرک سے لے کر وزیر اعظم تک سب کے لئے ہے۔ اس طرح جناب سجاد علی شاہ گہرائی میں اترے۔ سطح آپ بلبلے بھی چھوڑے اور انصاف کے طوفان سے سمندر پر چلنے والے طاقت ور ترین بحری بیڑوں کو پاش پاش کر دیا۔ اگر میاں نواز شریف کو سمندر میں فوجی جزیرے پر پناہ نہ ملتی تو تاریخ کا باب کچھ اور ہی رقم ہوتا۔ جہاں نواز شریف قانون کی حکمرانی کی بے رحم لہروں سے ٹکڑا کر اپنا جہاز ڈبو چکے

ہوتے۔ مجھے اس طرح یاد ہے جب میں اسلام آباد جناب سجاد علی شاہ سے اور کالاباغ ڈیم کی تعمیر کے سلسلے رٹ دائر کی اور التماس کی کہ اس رٹ کی جلدی سماعت فرمائی جائے۔ توانہوں نے فرمایا کہ بلاشبہ یہ قومی معاملہ ہنے اور عوام کے بنیادی حقوق سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس سے بھی ضروری درخواستیں ہیں جن کو نمٹانا ہے بہر حال انتظار کیجئے۔ بعد ازاں ممتاز ادیب تنویر ظہور نے سابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب نسیم حسن شاہ کے بارے کتاب لکھی۔ اس کتاب کی رونمائی کی تقریب الحمرا ہال میں منعقد ہوئی جناب سید سجاد علی شاہ نے تقریب کی صدارت کی اس موقع پر جج صاحبان نے بھاری تعداد میں شرکت کی۔ اس وقت محاذ آرائی شروع ہو رہی تھی۔ ممتاز ادیب اور دانشور اشفاق احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ وزیر اعظم آگے آکر گھورتے ہیں تو شاہ صاحب پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ جب شاہ صاحب غصے میں آتے ہیں تو وزیر اعظم پیچھے ہٹ جاتے ہیں اس طرح دونوں ڈرامہ کر رہے ہیں۔ جب شاہ صاحب صدارتی تقریر کرنے لگے توانہوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف بات کہہ دی کہ جن جج حضرات کو سپریم کورٹ کے لئے Recommend ریکومنڈ کیا ہے۔ حکومت کو اس کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ شاہ صاحب نے اصولوں پر سمجھوتا نہ کیا۔ نواز شریف اور اس کے ان ساتھیوں کو توہین عدالت میں طلب کیا جنہوں نے عدالت کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے سپریم کورت پر حملہ کیا تھا۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ صاحب اپنی دھن کے پکے اور اصول کے سچے آدمی ہیں کوئی چیز ان کو اپنے موقف سے دستبردار نہیں کر سکتی۔ بہر حال جس طرح اس چیف جسٹس کو

اپنے عہدے سے ہٹایا گیا۔ وہ دنیا کی تاریخ کا منفرد قابل مذمت واقعہ ہے۔ اس سے عدلیہ کا تقدس مجروح ہوا۔ بہر حال اس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ ہمارے حکمران، حکمرانی کے لئے ہر چیز داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ جہاں تک سید سجاد علی شاہ صاحب کی ذات کا تعلق ہے تو وہ انتہائی ملنسار، شریف الطبع، اور با اخلاق انسان ہیں۔ عہدہ سے علیحدگی کے بعد ان کی شہرت میں جس قدر اضافہ ہوا وکلا برادری میں جس قدر مقام بلند ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تنویر ظہور کی یہ کاوش حد درجہ قابل تعریف ہے کہ انہوں نے ان کی یادیں قلمبند کیں۔ یادوں کی بارات سے کئی جہاں آباد ہوتے ہیں۔ کئی گوشے سامنے آتے ہیں۔ کئی قافلے اس کی روشنی میں منزلوں تک اپنے راستوں میں ترمیم کر لیتے ہیں اور کئی قافلے بنتے اور منزل کو رواں دواں ہوتے ہیں۔

کراچی میں مقیم ممتاز کاروباری، سیاسی اور سماجی شخصیت

میاں محمد اختر پگانوالہ

جسٹس (ر) سجاد علی شاہ صاحب سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب وہ سیشن جج ہوا کرتے تھے۔ بعد ازاں ان سے گاہے گاہے ملاقاتوں کا سلسلہ رہا۔ وہ بہت پر خلوص، ملنسار، مرنج مرنجان اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ ان سے ملنے والا ہر شخص ان کے بارے میں یہی رائے قائم کر سکتا ہے کہ وہ ایک دیانت دار اور محبّ وطن شخصیت ہیں۔ انہوں نے کبھی اپنے منصب کے ساتھ ناانصافی نہیں کی۔ اپنے فرائض منصبی اپنی سوچ کی پختگی اور سچائی کے ساتھ ادا کیئے۔

عدلیہ کے ساتھ وابستگی کے دنوں میں انہوں نے ہمیشہ قانون کی بالادستی کے لئے کام کیا۔ وہ کسی سیاسی دباؤ کے زیر اثر نہیں جھکے۔ کئی مرتبہ انہیں پریشانی بھی اٹھانا پڑی مگر انہوں نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا وہ اس پر چلتے رہے۔ ایک عام شہری کی طرح سادہ زندگی کو شعار بنایا اور فوائد اٹھانے اور مراعات لینے کے لئے کسی کے پاس نہیں گئے۔

ایک مرتبہ غالباً ان کی کسی زمین کا جھگڑا چل رہا تھا۔ مگر انہوں نے اس جھگڑے میں پڑنا گوارا نہ کیا اور وہ زمین کا ٹکڑا بیچ دیا۔ یہ ان کی خاندانی شرافت اور

اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے۔ ملک کو ایسے ہی بے لوث اور بے غرض کھرے اور صاف ستھرے لوگوں کی ضرورت ہے جو ذاتی فوائد کی قربانی تو دے دیں مگر جہاں کہیں اہم ملکی نوعیت کے مسائل در پیش ہوں وہاں کسی قسم کی مصلحت اور سودے بازی کو ضمیر کی آواز کے منافی سمجھیں۔

اکرم کنجاہی

تنویر ظہور نے جسٹس صاحب سے رابطے اور ایک طویل انٹرویو کے لئے وقت کے تعین کا کام چونکہ میرے سپرد کر رکھا تھا اس لئے کتاب کی اشاعت تک میرا جسٹس صاحب سے نہ صرف فون پر رابطہ رہا بلکہ ان سے ملاقات کا موقع بھی ملتا رہا۔

جسٹس صاحب کے ہاں عام آدمی سے لے کر وی آئی پی تک سب کی آمد آمد رہتی ہے۔ وہ نہایت منکسر المزاج ہیں۔ سب کے ساتھ ان کا برتاؤ ایک سا رہتا ہے۔ مہمانوں کو باعث رحمت سمجھتے ہیں اور مہمان نوازی جیسی اعلیٰ اخلاقی صفات سے متصف ہیں۔ ان کے ہاں سادگی اور نفاست ہے۔ ان کے اہل خانہ سے مل کر کسی ''برگر فیملی'' کا تاثر نہیں ابھرتا۔ بلکہ ایک عام اور محبّ وطن پاکستانی کا گھر محسوس ہوتا ہے۔

جسٹس صاحب نے عدلیہ سے وابستگی کے دوران بے شمار مقدمات کی سماعت کی اور فیصلے دیئے۔ ان میں سے کئی ایک مقدمات جو ملکی تاریخی میں بہت اہم تصور کئے جاتے ہیں ان کے بارے میں موشگافی کرنے کا حق تو قانون دانوں کو حاصل ہے۔ لیکن ایک بات بلاشبہ جسٹس صاحب کے کریڈٹ میں جاتی ہے

کہ انہوں نے جو بھی فیصلے دیئے ان پر کوئی دباؤ قبول نہیں کیا اور اپنی سوچ کی پختگی اور سچائی پر ڈٹے رہے۔

محمد حنیف

جب برادرم تنویر ظہور صاحب نے بتایا کہ وہ سید سجاد علی شاہ صاحب سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ پر کتاب لکھ رہے ہیں اور اس سلسلہ میں وہ دس دن کراچی رہ کر سید صاحب سے انٹرویو وغیرہ کر کے آئے ہیں تو میں نے ان سے عرض کی آپ تاریخ پر کتاب لکھ رہے ہیں اس لئے یہ کتاب پوری غیر جانبداری سے مرتب کریں۔ تاریخ کی کتاب کا معیار اگر سچائی کی بنیاد پر نہ ہو تو وہ فٹ پاتھ کی کتاب بن کر رہ جاتی ہے۔ والٹیئر نے سوانح لکھنے والوں کے بارے میں کہا ہے۔ زندوں کی عزت اور مردوں کے بارے میں صرف صداقت..... تنویر ظہور نے میری بات سن کر مجھے اس دور کے بحران پر اپنے خیالات تحریر کرنے کو کہا یہ مضمون تنویر ظہور کی اسی تحریک کا مرہون منت ہے۔

''قاضی'' کا ضمیر سچائی کا امین ہوتا ہے اس کا منصب بہت حساس۔ ذمہ داری کا۔ تدبر۔ برداشت کا ذاتی پسند ناپسند سے بلند ہوتا ہے۔ آئین ''قاضی'' سے قومی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر آئین کی حدود میں رہ کر قانون کی ایسی شفاف تشریح کا متقاضی ہوتا ہے جس سے انصاف ملتا نظر آئے۔ جو قاضی آئین کے اس سخت ترین معیار پر پورے اترتے ہیں وہ تاریخ میں امر ہیں اور جو قاضی حاکم وقت کی خواہشوں کے تابع اور اپنی ضرورتوں کی فکر میں مبتلا ہوتے ہیں وہ تاریخ میں سیاہ باب بن جاتے ہیں اور جو قاضی اس منصب کو

محفوظ سرکاری ملازمت سمجھ کر گزارتے ہیں ان کا آنا اور جانا ایک برابر ہے۔ قاضی کا کردار اور اس کے فیصلے قوم کو تاریکی میں روشنی اور مایوسی میں حوصلہ عطا کرتے ہیں۔ انصاف کا ادارہ عوام کی تہذیب میں بقا کی بنیاد رکھتا ہے۔ اگر بد نصیبی سے کسی ملک کے ادارے سے حکام و سرکار کی بد اعمالیوں کی وجہ سے مفلوج اور بد عنوان ہو جائیں۔ مگر ایک ادارہ "عدل" کا اپنی صداقت پر پوری دیانت سے قائم ہے اور عوام کے دلوں میں جزا اور سزا کا احساس متحرک ہے تو یقیناً وہ ملک اس ادارے کی قوت سے جلاوبدیر اپنی عظمت کے اوج کو واپس حاصل کر لے گا۔ اگر خدانخواستہ انصاف برائے سیل اور قاضی بے اعتبار ہو تو اس ملک میں تشدد۔ جرائم۔ ذلت۔ نفرت۔ ٹڈی دل کی طرح اٹڈ آتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے ایسی صورت حال میں پھر قاضیوں کو بھاگ کر یا چھپ کر جان بچانا پڑی ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے قاضی کا حساب آخرت میں بڑا سخت ہو گا۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے جس نے قاضی بننے کی خواہش کی وہ قاضی بننے کا اہل ہی نہیں ہے۔ جب کہ ہمارے مَن میں ایک لاکھ دس ہزار روپے فی کیس لینے والا وکیل جس کی ماہانہ آمدنی لاکھوں روپے ہوتی ہے، جج بننے کے لئے حکام کے سامنے پیش پیش رہتا ہے۔

جناب امام ابو حنیفہ کو قاضی بننے کے لئے کہا تو انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر ان کو قید میں ڈال دیا گیا۔ جس پر انہوں نے کہا الحمد للہ میں آخرت کے کڑے عذاب سے بچ گیا۔ امام کا یہ قول اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ انسان پر بطور قاضی اللہ کی طرف سے جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس میں معمولی سی

لغزش بھی آخرت میں اس قدر سزا کی موجب بنے گی کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر سختی معمولی ہے بر صغیر خاص طور پر پاکستان میں تیس چالیس سال سے ایک تبدیلی جو لوگوں کے اندر پیدا ہوئی ہے وہ ''وطن'' اور ''قوم'' سے محبت کی بجائے شخصیت پرستی اور جذباتی نعروں کی ساحری میں اسیری ہے فہم وادراک اور تجزیہ کا ہنر سیاسی' مذہبی' شخصی' قانونی اور ذاتی فائدے حاصل کرنے کے داؤ پیچ کے گلیمر میں چند ھیا گیا ہے اب عالم کی موت ٹی وی۔ ریڈیو۔ اخبارات کے لئے اہمیت نہیں رکھتی قابل ذکر اور قابل فروخت چیز اداکار کے شب وروز کی لمحہ لمحہ کی سرخیاں ہیں۔ 53 سال پاکستان کی تاریخ میں جو اہم تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کی وجہ سے پاکستان کی فکری اخلاقی معاشی' سیاسی قدروں میں ہلچل پیدا ہوئی ان میں ایک واقعہ سابق صدر پاکستان سردار فاروق لغاری کے دور میں چیف جسٹس سپریم کورٹ سید سجاد علی شاہ صاحب اور وزیر اعظم پاکستان نواز شریف صاحب کا عدالتی مباحثہ ہے اس عدالتی مباحثہ کے پس منظر میں کیا محرکات تھے اور اغراض کی کون کونسی قوتیں گرہ لگا رہی تھیں اس اسرار پر تو مورخ روشنی ڈالے گا میرے نزدیک اس مضمون میں جناب سید سجاد علی شاہ صاحب سابق چیف جسٹس سپریم کورٹ کی شخصیت اور نیت پر ذاتی رائے ہے اس عدالتی مباحثہ کے دوران ایک حیرت انگیز بات جو دیکھنے میں آئی اس کا ذکر یہاں دلچسپ ہو گا۔ سیاستدان جو چھلاوہ کی طرح جست لگاتا ہے اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے اس عدالتی مباحثہ کے دوران (جبکہ حکومت کا مستقبل اور سیاسی صورت حال بالکل غیر واضح تھی) حکمران جماعت کے ممبران حلیف جماعتیں اور ان کے ارکان نواز شریف صاحب کے ساتھ پوری یک جہتی کے

ساتھ کھڑے تھے جب کہ سید صاحب کے ساتھ عدلیہ کے چند ساتھیوں کے علاوہ باقی سارے جج جن میں سید صاحب سے سینئر جج بھی تھے اس ساری صورت حال کو جو بظاہر ذاتی قسم کی لڑائی کی شکل اختیار کر گئی تھی، عوام کے ساتھ پریشانی سے دیکھ رہے تھے ان ججوں نے اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے فل کورٹ بنچ میں فیصلہ دیا کہ ججز فیصلہ کی رو سے سینئر ترین جج کو چیف جسٹس ہونا چاہئے اور فیصلہ کے فوراً بعد سینئر ترین جج کو چیف جسٹس کا حلف دلایا گیا اور اس طرح یہ مباحثہ معطل ہوا۔ اس دور کی یہ تمام عدالتی کارروائی نے پاکستان کی قانونی اور سیاسی تاریخ میں اک نئے باب کا اضافہ کیا۔ جو مورخ کے لئے یقیناً قابل توجہ اور فکری موضوع ہو گا۔ آدمی جو عمل کرتا ہے اس کا رد عمل جو ظاہراً سامنے نظر آتا ہے بات اسی کی کی جاتی ہے نیتوں کا حال تو بندہ یا اس کا اللہ جانتا ہے۔

سید صاحب کے چیف جسٹس کے دوران جو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں سے چند سوال سید صاحب کی خدمت میں عرض ہیں

1- جب آپ تین سینئر ججوں کو کراس کر کے بطور چیف جسٹس سپریم کورٹ حلف اٹھا رہے تھے اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟

2- جب وہاب الخیری ایڈووکیٹ کی رٹ پر آپ کی سربراہی میں فل بنچ نے فیصلہ دیا کہ سینئر جج چیف جسٹس ہو گا تو آپ نے اس فل بنچ کے بعد بھی سینئر جج کے لئے جو اصولاً اور قانوناً چیف جسٹس کے منصب کا حقدار تھا اس کے لئے عہدہ خالی کیوں نہیں کیا؟

3- نواز شریف صاحب کا کیس چیف جسٹس کی عدالت میں قانون کی تشریح اور

انصاف کے لیے پیش ہوا تھا اس دوران آپ ایک سیاستدان لیڈر کی طرح شہر شہر تقریریں کر رہے تھے اور ہر طرح کی تقریب رونمائی میں پہنچ جاتے تھے۔ ایک جج کے لئے کیا اُس طرح کی روایت پسندیدہ ہے دوسرے ایک جج کا اس طرح کا سماجی تعلق کیا فیصلہ پر اثرانداز ہونے کا موجب نہیں بن سکتا ہے ؟

4-جب فل بنچ کے فیصلہ کے بعد سینئر جج چیف جسٹس کے منصب پر بیٹھ گئے تو آپ نے اپنی سیٹ پر کام کرنے کے بجائے چھٹی لے لی کیا آپ کا یہ رویہ آپ کی خود پسندی یا احساس کمتری کا غماز تھا۔

5-ریٹائرمنٹ کے قریب آپ نے اچانک انکشاف کیا کہ میری تاریخ پیدائش کا اندراج غلط ہے حالانکہ آغاز ملازمت پر سرکاری فارم پر تاریخ پیدائش آپ نے ہی لکھی ہو گی چند ماہ مزید سرکاری ملازمت کے حصول کے لئے اپنے ہی لفظوں کی صحیح غلط کی یہ تکرار کیا ایک جج مدبر دانشور بااصول انسان درویش صفت شخصیت کے شایان شان ہے ؟

6-سابق کمانڈر انچیف بری فوج جنرل کرامت جہانگیر نے غیر ملکی رپورٹروں سے 11 اپریل 1999ء کو باتیں کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ جب وہ فوج کے سربراہ تھے تو اس وقت کے چیف جسٹس نے حکومت کے خلاف ان سے فوجی مدد طلب کی تھی۔ مگر فوج کے قانون دانوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ ایک تو قانون میں اس طرح کی اجازت نہیں ہے دوسرے اگر یہ ریت چل پڑی تو ہر محکمہ جب چاہے گا حکومت کے خلاف فوج سے براہ راست مدد طلب کرنے لگے گا۔ ایک شخص انصاف وعدل کے اعلیٰ ترین منصب پر بیٹھ کر فوج کو جمہوری حکومت ختم کرنے کے لئے بلاتا ہے' یہ اقدام قانون دانوں اور جمہوریت

پرستوں کے لئے بڑی اہمیت اور تحقیق کا ہے اور سید صاحب کے لئے وضاحت کا سوال ہے۔ جناب اعلیٰ حکومت مخالف سیاسی لوگوں اور ہر قیمت پر اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے والے لوگوں کی بلے بلے وقتی طور پر مسرور کن تو ہو سکتی ہے مگر دیرپا نہیں۔

دلشاد ادیب

سابق چیف جسٹس آف پاکستان جناب سجاد علی شاہ..... کا شمار ان معدوے چند اور قابل ذکر مقتدر قانون دان اور فیضیض میں ہوتا ہے جنہوں نے منصبی اعتبار و معیار کے نئے رخ متعین کر کے اپنی اصول پسند طبیعت کی دھاک حکومتی سطح پر منوائی۔ زیر نظر کتاب کے ذریعے معروف صحافی و شاعر جناب تنویر ظہور نے شاہ صاحب کی شخصیت کے مخفی گوشوں کو کمال فن کارانہ ہنر مندی اور بصیرت افروز صحافیانہ سلقید مندی سے یوں پردہ کشائی کی ہے کہ شاہ صاحب اپنی تمام تر دلچسپیوں مصروفیات اور وابستگیوں کے ساتھ ایک فلم کے کردار کی طرح ہمارے سامنے چلتے پھرتے اور گفتگو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عدلیہ کی تاریخ میں شہرت اہمیت اور مقبولیت کے افق پر جگمگانے والے روشن ستارے کی یہ ذاتی کہانی ایک ایسی تاریخی دستاویز کا روپ اختیار کر گئی ہے کہ اس کا ذکر ہمارے قومی سیاسی منظر نامے کا معتبر حوالہ ثابت ہو گا۔ اور اس قلمی و فکری قومی حوالے کی یکجائی پر جناب تنویر ظہور بجا طور پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔

جناب سیّد سجاد علی شاہ میری نظر میں!

1995- 96ء کے حکومت عدلیہ بحران کے ایام میں دوسرے اخبار نویسوں کی طرح مجھے بھی خوش قسمتی سے ان سے ملنے اور انہیں عدالت میں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے دیکھنے کا موقع ملا۔ سیّد سجاد علی شاہ کا ان دنوں محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ جھگڑا چل رہا تھا۔ محترمہ نے سید سجاد علی شاہ کو آؤٹ آف ٹرن پروموٹ کر کے جب چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدے پر فائز کیا تو ان کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ شائد جونیئر اور سندھی ہونے کے سبب وہ ان کے احسان مند رہیں گے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا کیونکہ سجاد علی شاہ بھی سیّد زادے تھے۔ اس وقت کفر کے سامنے ڈٹ جانے کا معاملہ تو در پیش نہ تھا لیکن آمرانہ ذہن رکھنے والی ایک خاتون وزیر اعظم بہر حال ان کے مدمقابل ضرور تھیں۔ سجاد علی شاہ بھی اس وقت تک محترمہ سے ہرگز نہ الجھے جب تک سردار فاروق لغاری اور جنرل جہانگیر کرامت کی طرف سے انہیں تھپکی نہ دی گئی۔ اسی طرح انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بعض سینئر افسران بھی سید صاحب سے بالمشافہ اور بلا مشافہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ 1996ء کے ابتدائی ایام میں محترمہ ڈٹی رہیں لیکن پھر انہوں نے صلح صفائی کے لئے کوشش شروع کر دیں اور اس سلسلے میں ایک سابق سفارتکار اور ایک انٹیلی جنس ایجنسی کے سربراہ نے اہم کردار ادا کیا تاہم اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی اور پلوں کے

نیچے سے پانی گزر چکا تھا۔ سو مفاہمت کی کوشش ناکام ثابت ہوئیں اور محترمہ کو گھر بھیج دیا گیا۔ بے نظیر بھٹو کے دور حکومت میں نواز شریف کی حمایت سیّد سجاد علی شاہ اور فوج کے پلڑے میں تھی لیکن اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ سردار فاروق لغاری کی سازش کا شکار ہو کر شاہ صاحب سے الجھ بیٹھے۔ اور کئی دفعہ ایسے مراحل بھی آئے جب لگ رہا تھا کہ نواز حکومت اب گئی کہ اب گئی۔ لیکن خوش قسمتی نے نواز شریف کے قدم چومے اور آخر کار پہلے سردار فاروق لغاری اور پھر شاہ صاحب کو گھر جانا پڑا۔ توقع تھی کہ سجاد علی شاہ بحرانوں کے اس دور کے بارے میں کھل کر اظہار کریں گے لیکن نہ جانے وہ کون سی مصلحتیں تھیں کہ انہوں نے سنسنی خیز انکشافات اپنے سینے میں ہی رکھ لئے۔ لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ انہوں نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس وقت کچھ نہ کچھ لکھ دیا ہے جب نواز شریف ابھی تک برسر اقتدار ہیں۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ ابھی 1995-96ء اور 1996-97ء کے عدالتی بحرانوں کے بارے میں مزید لکھنے کی ضرورت ہے شاہ صاحب کو چاہئے کہ وہ کبھی نہ کبھی ان رازوں سے ضرور پردہ اٹھائیں جن پر ابھی تک مصلحتوں کی تہہ جمی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک شاہ صاحب کی کتاب اس سلسلے کا آغاز ہے اختتام نہیں۔

منیر احمد
ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکہ
0300-461788

سید سجاد علی شاہ ایک مضبوط انسان

میری نظر میں سید سجاد علی شاہ ایک معتبر مضبوط اور مستقل مزاج انسان ہیں وہ اصول پرست ہیں اور اپنے تمام کیریئر میں انہوں نے کبھی اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی نہیں برتی بلکہ ہمیشہ ایک ایسے جج کا کردار ادا کیا ہے جو اپنے ساتھی ججوں کی آراء اور فیصلوں کے دباؤ میں بھی نہیں آتا اور ہمیشہ اپنی ذاتی ججمینٹ کی حیثیت بحال رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بر عکس فیصلے لکھنے والے ساتھی ججوں نے بھی بعد میں ان کے فیصلوں کی تائید اور تعریف کی۔ باقی جہاں تک انصاف کی بات ہے تو یہ آئین اور سسٹم نے فراہم کرتا ہے۔ جج تو صرف اس آئین کی پاسداری کرتے ہوئے اور سسٹم میں رہتے ہوئے اور اس کے تمام تقاضے پورے کرتے ہوئے اپنے فیصلے دیتا ہے میرے نزدیک جسٹس صاحب نے ہمیشہ آئین کو اور نظام کو مکمل طور پر ملحوظ خاطر رکھا ہے اور اپنے فرائض کی بجا آوری

میں کوتاہی نہیں برتی۔ پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ میں بہت کم ججز ایسے ہیں جنہوں نے نمایاں اور تاریخ میں یاد رہ جانے والے فیصلے کئے ہوں۔ اور سید سجاد علی شاہ ان میں سے ایک ہیں۔ میری رائے کے مطابق اگر کسی طرح ہمیں اس غلامانہ نظام سے نجات مل جائے اور کوئی بہترین نظام نصیب ہو جائے تو شاہ صاحب کے مزاج اور کردار کے حامل ججز کا اپنی اعلیٰ منصفانہ صلاحیتوں کا کردار اور زیادہ آزادی اور ہمت سے ادا کر سکتے ہیں۔

ملک اکرم اعوان

کسٹوڈین متروکہ املاک چیئرمین انسداد دہشت گردی عدالت (اسپیشل کورٹس) چیئرمین اسپیشل اپیلیٹ کورٹ (کسٹمز) اور چیئرمین صوبائی الیکشن اتھارٹی کی اضافی ذمہ داریاں بھی سپرد کی گئیں۔ وہ مہران یونیورسٹی آف انجینئرنگ کی سنڈیکیٹ اور سینیٹ کے رکن اور آغا خان یونیورسٹی کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے ممبر بھی رہے ہیں۔ وہ 1989ء میں کچھ عرصہ کے لئے سندھ ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس رہے اور اس کے بعد اس سال ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کا عہدہ سنبھال لیا۔ 1992ء میں انہیں سپریم کورٹ کا جج مقرر کیا گیا اور 5 جون 1994 کو انہوں نے چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدہ کا چارج سنبھالا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پاکستان لا کمیشن کے چیئرمین پاکستان جوڈیشل اکیڈمی کے چیئرمین اور سپریم جوڈیشل کونسل آف پاکستان کے چیئرمین کی حیثیت سے بھی فرائض انجام دیتے رہے ۔ وہ مختلف بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجلاسوں میں پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں جن میں نیشنل جوڈیشل کالج نویڈا امریکا میں منعقد پروگرام کمپیوٹر ٹیکنالوجی برائے کورٹس بیونس آئرس ارجنٹائن میں منعقدہ انٹر نیشنل لا ایسوسی ایشن کی 66ویں کانفرنس اور 1995ء میں لندن میں منعقدہ جوڈیشل فورم شامل ہیں وہ اگست 95ء میں چین کے دارالحکومت بیجنگ میں منعقدہ چیف جسٹس کانفرنس اور اسی سال کینیڈ میں ہونے والی چیف جسٹس کانفرنس میں بھی پاکستان کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ وہ دسمبر 1997ء کو چیف جسٹس آف پاکستان کے عہدہ جلیلہ سے ریٹائر ہوئے۔

جینئس اور بہادر آدمی اپنے دشمنوں کو جس قدر سخت مزاج اور جابر نظر آتا ہے اتنا ہی اپنے دوستوں کے لئے لطیف اور نرم خو ہوتا ہے۔ سجاد علی شاہ صاحب دوستوں میں بہت گھل مل جانے والے، ملنسار، بردبار، سچے، کھرے اور متحمل مزاج انسان ہیں۔ لیکن موقف میں انتہائی سخت، مستقل مزاج، ثابت قدم اور اصول پرست اور صاف گو ہیں۔ جب اتنی ساری خوبیاں ایک انسان میں اکٹھی ہو جائیں تو پھر تاریخ اپنے اوراق کے سنہرے بازو ان کے لئے وا کر دیتی ہے، انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتی ہے اور ان پر فخر کرتی ہے۔

فرحت عباس شاہ

چیئرمین

پاکستان رائیٹرز کونسل

15 جون 1999ء